سید جاوید اقبال
عابدہ ہما

امیر اور تلامذۂ امیر کے روابط: مکتوباتِ امیر کی روشنی میں

امیر احمد امیر مینائی (۱۸۸۹ء۔۱۹۰۰ء) اُردو کے ایک معتبر شاعر ہیں اُن کے حوالے سے ایک روایت مشہور ہے کہ متاخرین کے زمانے میں دنیائے شاعری کا آدھا حصہ، امیر مینائی کے قبضے میں آ گیا تھا۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ آرائی ہو، لیکن اس سے ملتے جلتے بیانات، امیر کی تقریباً تمام سوانح عمریوں میں بھی ملتے ہیں۔ اور ان کے تلامذہ کا تذکرہ امیر کے بارے میں لکھی جانے کتابوں کے علاوہ شعرائے اردو کے تذکروں اور ادبی تاریخوں میں خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔ اور ایک آدجگہ شاگردوں کی فہرستیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جس کی وجہ سے امیر کا مسلکِ شاعری قابل پیروی قرار پایا، تربیت کا وہ کون سا نظام تھا، جس کی بدولت امیر کے تلامذہ ایک عرصے تک اردو شاعری پر چھائے رہے یا امیر کی شخصیت کا وہ کون سا پہلو ہے کہ جس کے سحر میں سیکڑوں طالب علم گرفتار رہے۔ ان تمام سوالات کے جوابات ہمیں آسانی سے امیر کے خطوط میں مل جاتے ہیں۔ بلاشبہ اگر مکتوباتِ امیر منظرِ عام پر نہیں آتے، تو امیر مینائی کے استادانہ مرتبے اور تلامذہ کی بابت بہت سے گوشے تشنہ رہ جاتے۔ کیوں کہ امیر کے اعلیٰ مرتبے اور شاگردوں کی تربیت سے متعلق بہ کثرت معلومات ہمیں امیر کے خطوط ہی میں ملتی ہیں۔، چناں چہ اس مقالے میں امیر کے طریقۂ اصلاح اور سلسلۂ تلامذہ کے حوالے سے مکتوباتِ امیر کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے یقیناً اردو ادب میں امیر کی شخصیت کا ایک ایسا پہلو سامنے آئے گا جو اب تک پردہ خفا میں تھا اور ہمیں اس نظامِ فکر سے بھی آگاہی ہوگی جس کے بانی امیر مینائی ہیں۔ جس نے متاخرین کے دور میں اردو شاعری کو فنی اور فکری اعتبار سے نئے معنی و مفہوم دیے۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد لکھتے ہیں کہ:

> ''امیر نے اپنی شخصیت سے ایک اسکول یا تحریک کی بنیاد ڈالی۔ ان کی وفات کے بعد بھی کوئی تیس برس تک یہ تحریک ترقی کرتی رہی۔ اگر پچھلی دو جنگیں اسے صدمہ نہ پہنچاتیں تو شاید بہت دنوں تک یہ تحریک چلتی رہتی لیکن نئے معاشرتی تقاضوں اور یورپی اصولِ شعر کے سامنے اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا'' [۱]

بلاشبہ امیر کا رنگ شاعری پھیکا ضرور پڑ گیا۔ لیکن ختم نہیں ہوا۔ وہ نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو کر ابھرا اس لیے کہ شاعری اور زبان سے متعلق جو اصول و قواعد انھوں نے بنائے اور برتے وہ اردو شاعری کی روایت بن گئے اور اس کی پیروی سے شاعری کا ایک معیار قائم ہوا ہے۔ اس حوالے سے ایک اچھی مثال، ڈاکٹر ابو محمد سحر نے پیش کی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

> ''وسیم خیر آبادی کے توسط سے ان (امیر) کا خاندان تلمذ فراق گورکھپوری تک پہنچتا ہے۔ جو دورِ حاضر کے اہم ترین غزل گویوں میں سے ہیں'' [۲]

اس کے علاوہ جلیل کے توسط سے کسریٰ منہاس اور ول شاہ جہاں پوری کے توسط سے شبنم رومانی تک پہنچتا ہے جو موجودہ دور میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ کسریٰ منہاس اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''بلاخوفِ تردید یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ معاصرینِ امیر مینائی میں سے کوئی ایسا نہیں گزرا، جس کے شاگردوں کو شاگردانِ امیر کے مقابلے میں رکھا جاسکے''۔[۳]

سید محمد عبدالحکیم حکمت لکھتے ہیں کہ:

''جیسے بااستعداد و باوقار تلامذہ حضرت کو دستیاب ہوئے۔ ویسے ان کے ہم عصروں کو ہرگز میسر نہیں ہوسکے''۔[۴]

کسریٰ منہاس، عبدالحکیم حکمت کے علاوہ احسن اللہ ثاقب نے بھی خطوط ''منشی امیر احمد'' کے مقدّمے میں اسی بابت اظہارِ خیال کیا ہے۔[۵] حقیقت یہ ہے کہ امیر نے اپنے شاگردوں پر خصوصی توجہ دی۔ انھوں نے تربیت کا ایسا نمونہ پیش کیا جو عموماً خانقاہوں، مدرسوں میں رائج ہوتا ہے۔ جس میں ہر شاگرد پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور جب تک شاگرد پہلا سبق یاد نہ کرلے دوسرا نہیں دیا جاتا۔ یہاں نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تعلیم پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی ہے اور وہ علم جو سینہ بہ سینہ منتقل کیا جاتا ہے، ان دونوں کے علاوہ ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاگرد علم اور عمل دونوں میں کامل ہوجاتا ہے اور عملی زندگی میں اعتماد کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ امیر نے بھی بعینہٖ یہی انداز اپنایا۔ اس کی وجہ سے ان کے شاگرد فرماں بردار بھی تھے اور باصلاحیت بھی۔ انھی خوبیوں کے باعث امیر کے متعدد شاگرد صاحبِ سلسلہ بھی ہوئے۔ ان میں سے بعض کا سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ جو رتبہ امیر کے تلامذہ کو نصیب ہوا وہ ان کے معاصرین میں سے کسی کے شاگردوں کو حاصل نہیں ہوسکا۔ یہاں تک کہ داغ کی وفات کے بعد ان کی جگہ امیر کے جانشین جلیل مانک پوری استاد السلطان ہوئے اور فصاحت جنگ خطاب ملا۔

(۲)

امیر کے شاگردوں کی تعداد:

امیر کے شاگردوں کی تعداد کے بارے میں کوئی واضح صورتِ حال نہیں ملتی۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ: ''تلامذہ امیر کی تعداد اس قدر کثیر ہے کہ سب کو احاطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے''۔[۶]

ایک موقعے پر نعیم الحق آزاد شیخ پوری نے، امیر سے ان کے شاگردوں کی تعداد کے بارے میں دریافت کیا تھا تو امیر نے ۲۴ر جنوری ۱۸۹۲ء کے خط میں انھیں لکھا کہ:

''آپ میرے تلامذہ کی تعداد کیا دریافت فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی اسما ضبط نہیں کیے۔ ایک زمانے میں میرے فرزند اکبر محمد احمد قمر نے کچھ نام لکھے تھے۔ یاد پڑتا ہے سو سے زیادہ تھے۔ اس کے بعد سیکڑوں اور ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں اور زندگی باقی ہے تو ہوتے جائیں گے۔ ان سب کی فہرست تیار ہونا محال ہے۔ پہلے سے التزام کیا جاتا تو البتہ ممکن تھا''۔[۷]

ڈاکٹر ابو محمد سحر، ''پیامِ یار''، لکھنؤ، اگست ۱۸۹۰ء میں، جلیل مانک پوری کی جانب سے شائع ہونے والے ایک

اشتہار کی بنیاد پر رقم طراز ہیں کہ:

''جلیل مانک پوری نے امیر کے تلامذہ کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا اور اپنے برادرانِ خواجہ تاش سے مختصر حال اور کلام بھیجنے کے لیے التماس کیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کام آگے نہیں بڑھ سکا''۔ ۸

۱۹۳۰ء میں رسالہ ''نیرنگ''، دہلی کے ''امیر نمبر'' میں تلامذہ امیر کی ایک فہرست شائع ہوئی جس میں صرف انتیس[۲۹] کا ذکر ہے۔ اسی فہرست کو ۱۹۴۱ء میں شاہ ممتاز علی آہ نے اضافے کے ساتھ اپنی کتاب ''امیر مینائی'' ۹ میں شائع کیا ہے جس میں تلامذہ کی تعداد پینتالیس[۴۵] ہے۔ انھوں نے شعراء کے نام اور تخلص کے علاوہ مختصر کوائف بھی درج کیے ہیں:۔

ابر، منشی واحد علی قدوائی۔ برہم، حکیم محمد عبدالکریم خاں فتح پوری۔ بسمل، منشی عبدالرحمٰن۔ بسمل منشی واحد علی کاکوری۔ بسمل، منشی محمد حسین خیر آبادی۔ بے نظیر، بے نظیر شاہ وارثی۔ ثاقب، احسن اللہ خاں۔ جاہ، نواب سید بنیاد حسین۔ جگر، حکیم محمد افتخار علی بسوانی۔ جلیل، حافظ جلیل حسن مانک پوری۔ حسرت، مولوی محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی، حسن، منشی محمد حسین صاحب فیض آبادی۔ حفیظ، حافظ محمد علی جونپوری۔ خلیل، حافظ خلیل حسن صاحب مانکپوری۔ خیال، دانش، مولوی محمد ریاض حسن خان۔ [قاضی عبدالودود (''اصول تحقیق'' جلد دوّم، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۱۹۸۸ء ص ۳۹) لکھتے ہیں ''دبدبہ امیری'' جو پٹنہ میں لکھی گئی ہے۔ ریاض حسن خاں خیال کو جو اس کی اشاعت کے وقت زندہ اور مقیم پٹنہ تھے۔ مرحوم کہا اور شاگردِ امیر بتایا ہے۔ وہ خود مجھ سے کہتے تھے کہ میں امیر نہیں داغ کا شاگرد ہوں''۔] دل، منشی ضمیر حسن خاں شاہجہاں پوری۔ راز، منشی امتیاز احمد خاں رام پوری۔ رضا، مولانا برکت اللہ فرنگی محلی۔ ریاض، سید ریاض احمد خیر آبادی۔ زاہد، سید زاہد حسین سہارن پوری۔ سحر، سراج میر خاں بھوپالی۔ سرشار، پنڈت رتن ناتھ۔ شاداب، مولوی مہدی حسن خاں۔ شرر، مولوی عبدالحلیم، شفیق، سید حسن مرتضیٰ عماد پوری۔ شمیم، سید ولایت احمد خیر آبادی۔ شوق، منشی احمد علی قدوائی۔ صبا، مولوی محمد مظفر حسین اٹھوی۔ صفا، مولوی عبدالواسع اٹھوی۔ صفدر، نواب صفدر علی خاں رام پوری۔ عابد، سید عابد حسین سہسوانی۔ فدا۔ حافظ شاہ محمود علی اٹھوی۔ فصیح، مولوی فصیح الزماں۔ قرار، سیّد تصدیق حسین شاہجہاں پوری۔ قمر منشی قمر الدین سندیلوی۔ قمر، منشی بال کرشن لکھنوی۔ کوثر، حکیم عابد علی خیر آبادی۔ مذاق، نواب احمد حسین خاں پریانواں۔ ناظم، نواب یوسف علی خاں بہادر رام پوری۔ نایاب رسول پوری۔ نثار، منشی نثار حسین۔ نعیم، حکیم نعیم الزماں خاں۔ نواب۔ نواب کلب علی خاں۔ نیر مولوی نور الحسن کاکوروی، وسیم، سید محمد عسکری خیر آبادی۔

۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے ''مطالعۂ امیر'' ۱۰ میں امیر کے چار صاحب زادوں (محمد احمد صریر مینائی، لطیف احمد اختر مینائی، ممتاز علی احمد آرزو مینائی، مسعود احمد ضمیر مینائی) اور ممتاز علی آہ کے علاوہ اڑسٹھ[۶۸] تلامذہ کے نام درج کیے ہیں۔ جو ممتاز علی آہ کے پیش کردہ تلامذہ کے علاوہ ہیں۔ درج کیے جاتے ہیں:

آزر، محمد احمد۔ آزاد، نعیم الحق شیخ پوری۔ آغا، عبدالاحد رام پوری۔ آہ، عبدالعزیز اٹھوی۔ احمد، سہیہ احمد علی۔ اخگر، ہادی یار خاں۔ اخلاص، عبدالشکور بھوپالی۔ اصغر، اصغر علی خاں رام پور۔ اصغر، محمد فیاض احمد جھنجھانوی۔ اعجاز، محمد عبدالحئی۔ انداز، نظام احمد۔ بخت، قیام الدین جونپوری۔ بشیر ملیح آبادی۔ بسمل، افضال احمد۔ بیتاب، بشارت اللہ۔ مجال، خیالی رام پوری۔ جوہر، عبدالعزیز غازی پوری۔ جوہر، مرزا احمد شاہ بیگ حسام، حسام الدین کاکوروی۔ حسرت، محمد علی خاں۔ حسن، شاہ محمد حسن صابری۔ حیدر، حیدر علی خاں۔ فرد، محمد مرتضیٰ خاں۔ ذکا، بخشش محمد رام پوری۔ ڈاکٹر بھولا ناتھ۔ ساجد، ساجد علی۔ سرخوش، حلیم الزماں خاں۔

شاداں، جمیل احمد شیخ پوری۔ شریف، شریف الزماں۔ شوق، مکھن لال بریلوی۔ ضابط، احمد علی خاں۔ ضو، نعیم الحق شیخ پوری۔ عاشق، عاشق الزماں خاں۔ عاصی، گوہر علی خاں۔ عاقل، عطا اللہ گورکھپوری۔ عتیق، دوست محمد خاں حسن پوری۔ عجیب لالہ دامودر سین عرف ڈوری لال۔ غریب، الٰہی بخش مرجان رقم۔ فدا، شاہزادہ مرزا ولی الدین۔ خدا، عبدالحکیم فریدی مانکپوری، فصیح، عبدالرحیم خاں۔ فضا، محمد عالی خاں۔ فیض، محمد ابوالفیض مجددی عرف ممن۔ قمر، مان سنگھ دیوبندی۔ کیف، محمد عالم گیر خاں ٹونکی۔ لطافت، سید لطافت علی۔ لائق، لالہ گنج بہاری لال۔ محمد ابوالشرف مجددی عرف اچھن صاحب۔ محمد المجاز حسن خان۔ مخزون، محمد علی خاں ماہونوی۔ مرتضیٰ، سید محمد مرتضیٰ۔ مظہر، مظہر الاسلام۔ مغموم، علی محمد خاں۔ ممتاز احمد ممتاز شاہجہاں پوری۔ نواب مہدی حسین خاں۔ موج، امیر احمد مانکپوری۔ مہر، محمد شفیع کاکوروی۔ مہر، محمد مہر شاہ۔ مہر، میر سعادت علی۔ ناطق، لکھنوی۔ نفیس، اچھے صاحب۔ نیاز سید نیاز احمد خیرآبادی۔ وزیر، وزیر علی خاں۔ وفا، عبدالہادی خاں رام پوری۔ ہوش، کالی چرن۔

۱۹۸۵ء میں عرفان عباسی کی ''دبستان امیر مینائی'' [۱۱] کے نام سے قابلِ قدر کتاب شائع ہوئی۔ جس میں بہ حیثیت مجموعی دوسو چار [۲۰۴] تلامذہ کو شامل کیا گیا ہے۔ ان میں ایک سوستر [۱۷۰] کے حالاتِ زندگی اور انتخابِ کلام بھی دیا گیا ہے جب کہ بقیہ کے صرف نام ہیں۔ ذیل میں ان اٹھاسی [۸۸] شاگردوں کے نام پیش کیے جاتے ہیں جو مذکورہ فہرست میں شامل نہیں ہیں:۔

اثر حسین الادین احمد۔ اثر، محمد یوسف ردولوی۔ اثر، الٰہی بخش ریوائی۔ آثم، حضور احمد خاں بریلوی۔ احمد، علی الدین احمد اٹاپی۔ اختر، نذر محمد خاں خیرآبادی۔ اخگر، رضی علی کاکوروی۔ آرام، سید نجف علی شاہ آبادی۔ آزاد، شاہ امراؤ علی امیٹھوی۔ اشک، محمد صادق۔ اظہر، اظہر علی سہسوانی۔ اعجاز، عبدالعزیز سہسوانی۔ انجم، نجم الدین احمد سندیلوی۔ انور، نورالحسن بلگرامی۔ برق، محمد علی حسین خان۔ برق، جوالا پرشاد ممدوی۔ برق، حکیم الدین کاکوروی۔ بسمل، شیخ محمد زماں بجنوری جلالوی۔ بسمل، اشرف لال رام پوری۔ بہار، سید علی قادری مدراسی۔ بیدل، واحد نور خاں باندوی۔ ثابت، سید افضل حسین لکھنوی۔ ثروت، مشرف جاں بیگم بھوپالی۔ حامد، محمد حامد علی خاں شاہ آبادی۔ حسرت، سید ذاکر اللہ کڑوی۔ حیف، وجیہ الدین احمد خان رام پوری۔ خستہ، غلام حضرت خاں رام پوری۔ خلیق، محمد نصر اللہ خاں حسن پوری۔ خیال، محمد صفدر علی خاں۔ خیال، سید محمد علی شاہ جہاں پوری۔ دلگیر، عبدالوہاب۔ راز، فیاض احمد خیرآبادی۔ رفعت محمد داؤد بمبوی۔ رفیق باپوڑی، روش، عنایت اللہ روش بدایونی۔ زار، بانکے لال بریلوی۔ سائل، عبدالحق مونگیری۔ سحر، سراج منیر خاں بھوپالی۔ سلیم، فیض الحسن فاروقی سہسوانی۔ شرر، عبدالکریم بھولپوری، شرر، ارتضی علی کاکوروی۔ شمس، تصدق حسین خاں لکھنوی۔ شوخ، سید اقتدار علی بلگرامی۔ شوخ، محمد حسین علی خاں۔ شوق، شاہ جہاں پوری۔ شیدا، سید علی مہندا خاں۔ صفا، عبدالحق رام پوری۔ ضبط۔ نیاز علی خان۔ عاصی، احمد علی خان نارنولی۔ عبرت، سید ظفر حسین کراروی۔ عبرت، گورکھ پرشاد گورکھپوری۔ عجیب، محمد حسن گورکھپوری۔ عیش، مجتہد الدین بدایونی۔ فروغ، ریاض الرضا خاں شاہ جہاں پوری۔ فصیح، محمد عبدالکریم۔ قدیر، غلام حسین خاں۔ قمر، سید ہادی حسین بریلوی۔ قیصر، علیگ۔ کوثر، حکیم عابد علی خیرآبادی۔ گستاخ، کرامت اللہ رام پوری۔ لطیف، اکرام احمد بدایونی۔ محسن، دیوان امرناتھ امرتسری۔ محو، شفیع بدایونی۔ مسرت منور جہاں بیگم بھوپالی۔ مشتاق، غلام رسول خاں رام پوری۔ مشتاق، اشتیاق احمد سلونوی۔ مضطر، افتخار احمد خیرآبادی۔ مغموم، علی محمد خاں لاچوری۔ مفتون، فصیح اللہ خاں۔ منظر، مولوی محمد اصغر سہتاپوری۔ ناطق، سید اشتیاق حسین بریلوی۔ نگہت، ظہور حسن کاکوری۔ نوح،

محمد نوح ناروی۔ عاقل، عطااللہ گورکھپوری۔ محمد ابوالحسن خاں رسول پوری۔ مست، عبدالمجید بنارسی۔ اظہر، مودودی۔ برق لکھنوی۔ بہار مدراسی۔ وحید، سید وحید حسن۔ صغیر گورکھ پوری۔ ضیاء اکبرآبادی۔ معنوی شاگردوں میں تین نام ہیں:

۱۔ قمر جلالوی، ۲۔ سوز بارہ بنکوی، ۳۔ شفق امروہوی۔

سرفراز علی رضوی نے احوال شعرا و مشاہیر جلد سوم۱۲ میں امیر کے ایک سو تین [۱۰۳] تلامذہ کی فہرست دی ہے۔ ان میں چودہ [۱۴] نام پہلی مرتبہ منظر عام پر آئے ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

ابرو، مچھلی شہری، احمد حسن حافظ۔ ادیب، لکھنوی۔ تفصیل حسین منشی سید۔ اسلم، کانپوری۔ سلامت اللہ۔ خوش دل، مظفر پوری۔ محمود علی خاں۔ رضا لکھنوی، رضا حسین۔ رنگین حیدرآبادی، محمد ایوب۔ صابر، قادر شریف۔ ضعف لکھنوی، غلام عباس شیخ۔ فرہاد بہاری، نظیر حسین حکیم سید۔ قدیر رام پوری، غلام حسین خاں۔ گستاخ رام پوری، کرامت اللہ خاں۔ نشتر مچھلی شہری، محمد طہ۔ واحد رام پوری، واحد علی شیخ۔ ہاشمی صفی پوری، نورالحسن محمد۔

ان تلامذہ کے علاوہ تلاش و جستجو سے آٹھ [۸] کا اور پتا چلتا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں:

عابد، منشی عابد حسین صدیقی سہوانی ۱۳، شرر، ارتضیٰ علی ۱۴، رخشاں، مطیع احمد ۱۵، پردیسی، مولانا قطب الدین برہمچاری ۱۶، بدر، بدرالحسن ۱۷، احقر، کان کنور ۱۸، بے چین، منشی عبدالحی بدایونی ۱۹، راز پیارے خاں ۲۰ اور وفا پیارے خان۔

الغرض مجموعی طور پر دو سو تیئس (۲۲۳) تلامذہ کے بارے میں پتا چلتا ہے۔ توقع ہے کہ تلاش و جستجو سے اور بھی شاگردوں کے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

یہ تو تھی امیر کے شاگردوں کی تفصیل اب امیر کے طریقۂ اصلاح کی جانب آتے ہیں۔

(۳)

تلامذہ کے کلام پر امیر کے طریقۂ اصلاح کے بارے میں معلومات ان کے خطوط میں بکھری ہوئی ہیں۔ جن کو مربوط کیا جائے تو ایک مکمل نظام ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندوستان بھر سے روزانہ شاگردوں کا کلام اصلاح کے لیے آیا کرتا تھا۔ ''دفتر امیر اللغات'' قائم ہونے کے بعد سے معتمد خطوط کو علیحدہ بستے یا صندوقچے میں جمع کرتا جاتا تھا۔ جیسا کہ امیر، کوثر خیرآبادی کو لکھتے ہیں کہ: ''جو کلام یہاں پہنچا وہ نذر وسیم ہوا'' ۔۲۲ روزانہ لغت کے کام سے فارغ ہونے کے بعد امیر کلام پڑھ کر اصلاح تحریر کر دیتے تھے۔ ہر خط کا جواب عموماً باری آنے پر دیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی بعض چہیتے شاگردوں کو جواب فوراً بھی ارسال کر دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ مقامی شاگردوں، جن میں ''دفتر امیر اللغات'' میں کام کرنے والے بھی شامل تھے۔ لغت کے کام سے فارغ ہونے کے بعد اپنا کلام سناتے اور امیر کو کلام میں جہاں اصلاح دینا ہوتی متوجہ کر دیتے تھے۔ اس دوران اپنا کلام بھی شاگردوں کے سامنے پڑھتے یا تلامذہ کی فرمائش پر تازہ کلام کہتے اور قریبی شاگرد جیسے ریاض خیرآبادی، وسیم خیرآبادی ممتاز علی آہ یا جلیل مانک پوری وغیرہ اسے لکھتے جاتے۔ تلامذہ ان کے کلام پر بھی اعتراض کرتے تو دلیل کے ساتھ ان کی رائے مانگتے اگر اعتراض میں وزن ہوتا تو خوش دلی سے قبول کر لیتے۔ اس بحث و مباحثے سے شاگرد محظوظ ہوتے اور ان کی علمی بصیرت میں اضافہ بھی ہوتا تھا۔ امیر کے ایک شاگرد نعیم الحق آزاد شیخ پوری نے امیر کے طریقۂ اصلاح کے بارے میں جو معلومات اپنی کتاب ''حیات الشعراء'' میں تحریر کی ہیں انھیں اقتباس کیا جاتا ہے جس سے امیر کے نظامِ اصلاح پر روشنی پڑتی ہے۔

''بیرونی کلام کی اصلاح جلد ہو جاتی تھی۔ باوجود اس کے کہ امیر اللغات کی تالیف کی دھن لگی تھی۔۔۔ مقامی تلامذہ کی اصلاح کی حالت تو ایک خاص حالت رکھتی تھی۔ پھر بھی بیرونی تلامذہ کے کلام پر کچھ توجہ کم نہیں کی جاتی تھی۔ اصلاح کی حالت میں کلام پر گہری نگاہ ڈالی جاتی۔۔۔ وجوہِ اصلاح جو ضروری سمجھتے جاتے بدست حاشیہ پر لکھتے جاتے۔ خواہ مخواہ ہر شعر پر معمولی وجہ اصلاح نہیں ظاہر کی جاتی، جو شعر زیادہ پسند ہوتا، اس پر صاد بنا دیا کرتے۔ اگر معمولی سے زیادہ پسندیدگی تو دو بار صاد بنا دیے جاتے تھے۔۔۔

جو شعر اصلاح طلب نہ ہوتا بہ جنسہ چھوڑ دیا جاتا۔ بعض مصرع پورا ایسا بھی لگا دیا جاتا، جو شاگرد کی پسند پر رہتا اور اس کا اصل مصرع بھی بہ جنسہ رہتا۔۔۔ نمونہ اصلاح میں صرف وہی اشعار درج کیے جاتے جن پر اصلاح ہوتی''۔۲۳

امیر کے جانشین جلیل مانک پوری کے شاگرد کسری منہاس اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''امیر کا طریقۂ اصلاح یہ تھا کہ ان کے غیر مقامی شاگرد ڈاک کے ذریعے انھیں اپنا کلام ارسال کرتے تھے اور امیر ڈاک کے ذریعے حک و اصلاح کے بعد یہ کلام واپس بھیج دیتے تھے''۔۲۴

دوران گفتگو کسری منہاس نے بتایا تھا کہ استاد محترم جلیل کا طریقہ اصلاح بھی بعینہٖ امیر کے ڈھب پر تھا۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ:

''۱۸۸۹ء سے اصلاح کا طریقہ میں نے یہ دیکھا کہ شاگردوں کی غزل کبھی خود دیکھ کر اصلاح دیتے تھے۔ کبھی منشی سید محمد عسکری وسیم۔۔۔ اور ان کے بعد جلیل القدر نواب فصاحت جنگ حافظ جلیل حسن صاحب جلیل سے سنتے جاتے اور اصلاح لکھواتے جاتے''۔۲۵

پروفیسر نفیس صدیقی مولانا اطہر ہاپڑی کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

''میں منشی صاحب کی خدمتِ اقدس میں اکثر آتا جاتا، نہایت منکسر المزاج، متین و سنجیدہ بزرگ تھے۔ شام کو ان کے مکان پر احباب اور تلامذہ کا مجمع رہتا۔ منشی صاحب پیرانہ سالی کے سبب چھپر کھٹ پر تشریف رکھتے اور ان کے چاروں طرف مونڈھے اور کرسیاں بچھی ہوتیں۔ جن پر ہر شخص قرینے سے بیٹھا ہوتا۔ چھپر کھٹ کے قریب ایک چھوٹی سی میز اور کرسی بچھی ہوتی جس پر حافظ جلیل حسن جلیل مانک پوری بیٹھتے اور میز پر غزلیات کا بستہ ہوتا جو اصلاح کے لیے آتیں۔ وہ غزل پڑھتے جاتے اور منشی صاحب سنتے جاتے اور اصلاح دیتے۔ مشکل سے کسی غزل میں پانچ، چھے منٹ صرف ہوتے۔ اصلاح بہت عمدہ اور جلد دیتے''۔۲۶

کلام پر اصلاح درج کرنے کے دو طریقے تھے۔ کبھی تو الگ کاغذ پر لکھ دیتے تھے اور اس میں، جیسا کہ نعیم الحق آزاد لکھتے ہیں کہ: ''صرف وہی اشعار درج کیے جاتے جن پر اصلاح ہوتی'' یا پھر اسی خط پر جس پر کلام لکھا ہوتا، اصلاح درج کر دی جاتی۔ جیسا کہ حفیظ جون پوری کے نام خط سے ظاہر ہے:

''غزل آپ صاف اور خوش خط لکھا کیجیے۔ بین السطور بھی زیادہ چھوڑا کیجیے کہ دیکھنے میں نگاہ کو

تکلیف نہ ہوا کرے اور اصلاح لکھنے کی جگہ بھی رہے''۔ ۲۷

امیر کے مزاج میں نفاست پسندی اور نظم وضبط بہت زیادہ تھا۔ وہ اپنے کاموں میں سلیقہ مندی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ اور یہی توقع وہ اپنے تمام تلامذہ سے بھی رکھتے تھے۔ امیر کا رسم الخط بھی نہایت عمدہ تھا۔ اس کے علاوہ جب خطوط تحریر کرتے تو رموز واوقاف کا بہت خیال رکھتے تھے۔ امیر کی نفاست پسندی، نظم وضبط اور سلیقہ دیکھنا ہو تو ''امیر اللغات'' اور ان کے دواوین کا مطالعہ ومشاہدہ ضرور کرنا چاہیے۔ امیر اپنے ایک نہایت عزیز شاگرد زاہد حسین زاہد کو بھی اسی نوعیت کی روک ٹوک کرتے دکھائی دیتے ہیں:

''غزل میں شعر اس قدر گنجان اور جگہ تنگ کر کے آپ لکھتے ہیں کہ اصلاح دینے میں اور وجوہ لکھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ آئندہ سے واضح ہونا چاہیے''۔ ۲۸

اسی نوعیت کی ایک اور معلومات کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں بھی ملتی ہے:

''یہ غزل آپ کی سن کر میں نے بنائی۔ شعر اس کثرت سے اور تنگی کے ساتھ آپ لکھتے ہیں کہ کہیں اصلاح دینے اور وجوہ لکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ مجبوراً وجوہ قلم انداز ہوتے ہیں''۔ ۲۹

(۴)

امیر صرف شاعر ہی نہیں تھے۔ بلکہ وہ ریاست رام پور کے ایک فرض شناس ملازم، خاندان کے ذمہ دار سرپرست، باعمل وصاحب سلسلہ صوفی اور دفتر ''امیر اللغات'' کے مہتمم بھی تھے۔ خیال کرنا چاہیے کہ وہ ان تمام ذمے داریوں سے کس طرح عہدہ برا ہوتے ہوں گے اور ان تمام فرائض کے ساتھ سیکڑوں شاگردوں پر کس طرح توجہ دیتے ہوں گے۔ امیر کی دیگر مصروفیات صرف نظر کر کے صرف شاگردوں کے کلام پر اصلاح کے پہلو کا جائزہ لیا جائے تو حیران کن صورت حال سامنے آتی ہے۔ امیر کے مکتوبات سے پتا چلتا ہے کہ اصلاح کے لیے اس کثرت سے کلام آتا تھا کہ اس کے لیے دیگر کاموں کے علاوہ علاحدہ سے ایک دفتر درکار تھا۔ نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں کہ: ''روزمرہ دو چار، دس پانچ غزلیں ڈاک میں آتی ہیں''۔ ۳۰ زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں کہ: ''اصلاح طلب کے بستے پر ہو گئے ہیں ایک انبار لگا ہوا ہے''۔ ۳۱ کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں کہ: ''ممالک نزدیک ودور سے کلام اس کثرت سے آتا ہے کہ میرا دل چھوٹ جاتا ہے''۔ ۳۲ نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں کہ: ''صدہا احباب کا کلام بندھا پڑا ہے''۔ ۳۳ پھر لکھتے ہیں کہ: ''بستے کے بستے شاگردوں کے کلام سے بھرے پڑے ہیں''۔ ۳۴

امیر کی دیگر مصروفیات اور کثرتِ کار کی وجہ سے بہ کثرت خطوط جمع ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال میں کبھی کبھی کسی شاگرد کا کلام گم بھی ہو جاتا تھا۔ زاہد حسین کو لکھتے ہیں کہ: ''تمھاری غزل مکسِ جام شراب کھو گئی''۔ ۳۵ خط یا غزل گم ہونے کی مختلف وجوہات بھی امیر کے مکتوبات میں ملتی ہیں۔ مثلاً پہلی یہ کہ، ڈاک اتنی زیادہ آتی تھی کہ بہت جلد صندوقچہ بھر جاتا، جو مہینے میں کئی مرتبہ صاف کیا جاتا، ضروری کاغذات تو محفوظ کر لیے جاتے، بقیہ ضائع کر دیے جاتے تھے۔ تو غالباً بے خیالی میں بعض خطوط اور کلام ضائع ہو جاتا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ ڈاک کی کثرت میں کسی کا کلام فوری طور پر تلاش کرنا محال ہوتا تھا۔ تیسری وجہ یہ بھی ہوتی کہ مال واسباب کئی مرتبہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوا، اس میں بھی ڈاک ضائع ہو گئی یا غلطی سے کسی منٹھے میں رکھ دی گئی اور چوتھی صورت یہ تھی کہ کلام روزانہ بہ کثرت آتا، اس لیے امیر بھول جاتے کہ کس کا کلام آیا اور کس کا اصلاح ہو کر چلا

گیا۔ امیر ایک خط میں لکھتے ہیں کہ:

''چوں کہ ڈاک میں کاغذ بہ کثرت آتے ہیں اور صندوقچہ معمور ہو جاتا ہے لہٰذا مہینے میں کئی بار صاف کیا جاتا ہے کہ ضروری کاغذ مٹھوں میں بندھ کر بستوں میں بندھ جاتے ہیں۔ ماقی چاک ہوتے ہیں''۔[۳۶]

زاہد حسین کو لکھتے ہیں کہ: ''کلام اصلاح طلب کے مٹھے، جس بستے میں رکھے تھے وہ بستہ ہی غائب ہے۔ نقل و تحویل اسباب میں اکثر چیزیں پریشان ہوگئی ہیں''۔ دل شاہجہاں پوری کو لکھتے ہیں: ''مختلف کلام کثرت سے جمع ہے اس میں کہیں بے ترتیبی سے (غزل) ادھر ادھر ہوگئی، جواب ڈھونڈنے سے نہیں ملتی''۔ کوثر خیر آبادی کے نام امیر کے خط میں مذکور ہے کہ:

''وہ محبت نامہ جس میں حضرت تسنیم کی تاریخیں تھیں۔ پیشی کے مٹھے میں رکھ لیا تھا۔ مگر اسی مٹھے میں رکھنے کے خطوط اس زمانے میں اتنے ہو گئے کہ یہ خط بھول گیا''۔

کلام گم ہو جانے کی وجہ سے بعض شاگرد ناراض ہو جاتے تھے۔ اس صورت حال میں امیر استادانہ کروفر کے برخلاف نہایت عاجزی سے شاگرد کو اپنی مجبوریاں بتاتے اور معذرت خواہ ہوتے۔ ذیل میں زاہد کے نام خط کا جو اقتباس پیش کیا جا رہا ہے وہ اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اس میں امیر کی مصروفیات کی ایک جھلک بھی ملتی ہے۔

''کلام تلامذہ نزدیک و دور اس کثرت سے آتا ہے کہ میں ان کو کسی طرح دیکھ نہیں سکتا، قدردانان عذر شنو، مجھ کو تاخیر اصلاح پر معاف رکھتے ہیں۔ آپ بھی یہی شیوہ اختیار کیجیے ... بستے میں سو سے زیادہ وہ خطوط ہیں، جس میں مختلف اقسام کا کلام اصلاح طلب ہے۔ اب دیکھنا شروع کروں گا اور اس مہم کو جب تک سر کروں گا تب تک اور کلام آ جائے گا۔ ... نصف شب تک ہمت کروں تو یہ کام ہو سکے۔ دل و دماغ ضعیف ہو گیا''۔[۳۷]

امیر اپنی شدید مصروفیات کے باوجود نہایت خلوص کے ساتھ تلامذہ کے خطوط کے جوابات دیتے۔ کلام کی اصلاح کرتے اور تاخیر ہو جانے پر معذرت بھی کرتے۔ امیر کا یہ رویہ اتنا مخلصانہ تھا کہ شاگرد ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ اور پھر یہی تاثر گہرا ہوتا جاتا، گویا آہستہ آہستہ استاد کا رنگ شاگرد پر چڑھنا شروع ہو جاتا، یوں ان کا شاگرد ان کی تصویر نظر آتا۔ امیر کے نظامِ اصلاح کا یہ بھی ایک قابلِ ذکر پہلو ہے۔

(۵)

امیر انتہائی شفیق اور شاگردوں سے محبت کرنے والے استاد تھے۔ وہ اپنے تلامذہ پر خاص توجہ دیا کرتے تھے اور انھیں آگے بڑھانے کی فکر میں رہتے۔ حالاں کہ امیر کو ذمے داریوں اور فرائض کی بجا آوری نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اپنے بیرونی اور مقامی شاگردوں کا اولاد کی طرح خیال رکھتے۔ شاگرد مصیبت میں ہوتا تو وہ رنجیدہ ہوتے سب کام چھوڑ کر اس کی ہمت بڑھاتے اور اسے حوصلہ دیتے اور شاگرد خوش ہوتا یا کسی امتحان میں کامیاب ہوتا یا نوکری میں ترقی پاتا تو خوشی سے جھوم جاتے اور دعا پر دعا دیتے۔ احسن اللہ ثاقب کو امتحان کی کامیابی پر رقم طراز ہیں:

''امتحان انگریزی، درجہ اول میں کامیاب ہونا معلوم ہوا اور ایسا جی خوش ہوا کہ اپنی کامیابی کا مزا ملا۔

حق تعالیٰ وہ دن لائے کہ مژدہ صدر آرائی سننے میں آئے''۔۳۸؎

سید محمد نوح کو مشاعرے میں کامیاب غزل پڑھنے پر اس طرح مبارک باد دیتے ہیں:

''برخوردار بسمل کی تحریر سے لکھنؤ کے مشاعرے میں آپ کی گہرافشانی و شرکت کا حال معلوم ہو کر خوش ہوا۔ آپ موید من اللہ ہیں۔ حسرت ہوئی کہ میں [نے] اپنے کانوں سے آپ کا کلامِ فصاحت التیام آپ کی زبانی نہ سنا۔ والدعا''۔۳۹؎

سید محمد عبدالحکیم حکمتؔ ''دبدبۂ امیر'' میں لکھتے ہیں کہ: ''حضرت خدائے سخن اپنے تلامذہ کے ساتھ نہایت الفت و محبت رکھتے تھے اور انھیں اولاد کی طرح چاہتے تھے''۔۴۰؎ حکمتؔ کی رائے امیر کی بابت بالکل درست ہے۔ اس کا اندازہ اس مذکورہ اقتباسات کے علاوہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ امیر تلامذہ کی وہ غزلیں جو مشاعروں میں پڑھنے یا کسی گلدستے میں اشاعت کے لیے ہوتی تھیں۔ ان پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ اس عرصے میں، وہ اپنی زیادہ تر مصروفیات ترک کر دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر کریم الدین، امیر کے شاگرد فدا کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''جن دنوں سرکاری مشاعرے ہوتے تھے۔ حضرت کو بہت کم فرصت ہوتی تھی۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی خود غزل نہ کہہ سکتے تھے۔ تاہم یہ معمول تھا کہ شاگردوں کی غزل پر اصلاح دے کر فرماتے، صاف کر کے پھر دکھا لینا۔ اس کے بعد جس دن مشاعرہ ہوتا اس روز غزلوں کو پھر ایک نظر دیکھ لیتے تھے''۔۴۱؎

مقامی شاگردوں کے برخلاف، مشاعرے کے لیے بیرونی شاگردوں کے کلام کی اصلاح جلد ہو جاتی تھی۔ بشیر ملیح آبادی کے نام خط میں لکھتے ہیں: ''دو غزلیں آئیں۔ مشاعرے کی غزل دیکھ کر بھیجتا ہوں۔ دوسری بسبب علالت نہیں دیکھ سکا''۔۴۲؎ عابد کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں رقم طراز ہیں کہ: ''مشاعرے کی غزل میں نے فوراً دیکھ کر بھیجی''۔۴۳؎ ایک اور خط میں امیر کی جلد بازی اور پریشانی ملاحظہ کیجیے:

''آپ کا خط کھولا، بہت افسوس ہوا کہ شاید غزل وقت پر نہ پہنچے گی۔ مگر جلدی میں سن کر کچھ کچھ بنایا۔ خدا کرے مشاعرے تک پہنچے''۔۴۴؎

امیر وہ غزلیں جو مشاعرے کے لیے یا کسی گلدستے کی اشاعت کے لیے ہوتی تھیں۔ انھیں احتیاطاً بیرنگ بھیجتے تھے۔ اس طرح ان کے خیال میں گم ہونے کا امکان کم ہو جاتا تھا۔ حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں: ''غزل کے خیال سے خط بیرنگ بھیجتا ہوں''۔۴۵؎ زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں کہ: ''یہ خط محض بہ نظر احتیاط بیرنگ بھیجتا ہوں''۔۴۶؎ عابد کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں کہ: ''ٹکٹ ملفوف نہ تھا اور ہوتا بھی تو احتیاطاً بیرنگ بھیجتا''۔۴۷؎ احسن اللہ ثاقب کو رقم طراز ہیں کہ: ''اب کے بیرنگ خط بھیجنے کا قصور معاف ہو ٹکٹ لگا کر بھیجا تھا، وہ نہ پہنچا اب کے جل کر بیرنگ روانہ کیا''۔۴۸؎

امیر، مشاعرے کے علاوہ گلدستہ ''دامن گل چیں'' اور ''پیامِ یار'' میں شائع ہونے والی غزلیات کی اصلاح بھی جلد کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونوں گلدستے ان کے شاگرد نکالا کرتے تھے اور ''دامن گل چیں'' تو ایک زمانے میں امیر کی زیر نگرانی ہی نکلا کرتا تھا۔ ابو محمد سحر کے مطابق فروری ۱۸۸۶ء میں اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تھا''۔۴۹؎ ۱۴؍مئی ۱۸۸۵ء

کے خط میں احسن اللہ ثاقب کو لکھتے ہیں کہ: ''دامنِ گل چیں سے میرا خاص تعلق نگرانی کا ہے اور امور میں قمر با تفاق رائے کمیٹی کار بند ہوتے ہیں''۔۵۰ فروری ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ، جب امیر کو نواب کلب علی خاں نے رام پور میں دوبارہ طلب کیا تو انھوں نے یہ گلدستہ اپنے ایک شاگرد واحد علی بسمل کے حوالے کر دیا اور خود رام پور تشریف لے آئے۔ لیکن نگرانی کا کام جاری رہا۔ ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ کے خط میں امیر لکھتے ہیں کہ:

''جب پار سال میں لکھنؤ سے رام پور چلنے لگا تو اپنے ایک عزیز شاگرد واحد علی بسمل کو سپرد کیا کہ وہ اپنے شوق سے بقدر امکان اس کو سنبھالتے ہیں مگر سنبھل نہیں سکتا۔ اس لیے کہ مجھے یہاں مطلق فرصت نہیں جو کچھ کہوں یا شاگردوں کا کلام بنا سکوں''۔۵۱

۲۴ نومبر ۱۸۹۸ء کے تحریر کردہ امیر کے خط سے پتا چلتا ہے کہ ''دامنِ گل چیں'' ۱۸۹۹ء سے رام پور سے نکلنا شروع ہو گیا تھا۔

''گلدستہ دامنِ گل چیں جنوری سے باہتمام نور چشم لطیف احمد اختر پھر نکلے گا۔ یہ وہی پرچہ ہے جو ۱۸۸۵ء میں، میری زیر نگرانی نکل کر مقبول عام ہو چکا ہے''۔۵۲

امیر باوجود دیگر ذمے داریوں اور مکروہات دنیاوی کے بسمل کی مدد کرتے تھے۔ جس کی نوعیت یہ تھی کہ وہ تلامذہ کو ''گل چیں'' میں کلام بھیجنے کی تاکید کرتے اور وہ کلام جو ''گل چیں'' میں اشاعت کے لیے آتا اس کی اصلاح میں جلدی کرتے۔ اس کے علاوہ خود بھی کوشش کر کے جیسے تیسے اپنا کلام بھیجتے۔ یہاں تک کہ داغ سے بھی اصرار کرتے۔ برہم کو ایک خط میں لکھتے ہیں :''غزل آج دیکھ لی بھیجتا ہوں آپ صاف کر کے گل چیں میں بھیجیے''۔۵۴ ایک اور خط میں کوثر خیر آبادی کو رقم طراز ہیں:

''افسوس کہ طرح، گل چیں گزشتہ، جس دن آئی، اس دن خیال ہوا کہ ضرور دیکھ کر بھیجوں گا۔ پھر ایسے حالات رہے کہ آج تمھارے لکھنے پر غزل کا آنا یاد آیا۔ عذر خواہ ہوں اور غزل اسی وقت دیکھ کر بھیجتا ہوں''۔۵۵

۱۷ نومبر ۱۸۹۲ء کے خط میں منشی جمیل احمد شاداں کو غزل کی اصلاح کے ساتھ رقم طراز ہیں:

''فقیر ناتواں بیمار ہے۔ کئی بیماریوں کا پرستار ہے۔ شاعری صحت و طاقت کی طرح پیرانہ سالی میں رخصت ہو گئی۔ آپ کی غزل دیکھ کر بھیجتا ہوں''۔۵۶

ایک اور موقعے پر بیماری کے باوجود منشی جمیل احمد شاداں کی غزل کی اصلاح اس وجہ سے جلد کی کہ ''دامنِ گل چیں'' کے لیے تھی۔ امیر لکھتے ہیں:

''میں آج کل مریض ہوں اور امراض ایسے ہیں کہ سخت بے چین ہوں۔ چوں کہ یہ غزلیں ''گل چیں'' کی تھیں اس لیے میں نے اس حالت میں بھی دیکھ کر اصلاح دی''۔۵۷

نعیم الحق آزاد نے اپنے کلام کی اصلاح کی بابت دریافت کیا تو امیر انھیں تسلی کے لیے لکھتے ہیں کہ:

''آپ کی غزل اگر پہنچی ہو گی، تو اصلاح کے بستے میں رکھی ہو گی۔ مجھے اب تک اس کے دیکھنے کی نوبت نہیں آئی جب ''گل چیں'' کے چھپنے کا وقت آئے گا۔ دیکھ کر بھیج دی جائے گی''۔۵۸

الغرض ''گل چیں'' کی اشاعت تک امیر، اپنا اور تلامذہ کا کلام لکھنؤ ارسال کر دیتے تھے۔ اگر امیر یہ سب کچھ نہیں کرتے، تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن وہ فطرتاً نیک خصلت، ادب دوست اور ادب نواز تھے۔ شاگردوں کے کلام کو دیکھنا، اسے سنوارنا، روک ٹوک کرنا اور شائع کرانا امیر کا فطری شوق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اس کام میں گہرا خلوص نظر آتا ہے۔ اگر ذرا سی دقت اٹھالی جائے اور امیر کی زندگی کے اس دور کے حالات کا مطالعہ کر لیا جائے، جس دور کے خطوط سے اقتباس راقم نے پیش کیے ہیں، تو امیر کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ ہمارے خیال میں امیر کی شخصیت کا یہ رخ بھی ان کے نظام تربیت کا نہایت اہم پہلو قرار دیا جاسکتا ہے۔

(۶)

امیر پر مسائل تو اسی وقت سے ٹوٹنا شروع ہو گئے تھے۔ جب انھوں نے ''امیر اللغات'' کی تالیف کی حامی بھری تھی۔ پھر نواب کلب علی خاں کی وفات کے بعد اس میں اضافہ ہوا اور اس کے بعد ہر روز اس میں ایک نئی علت شامل ہوتی گئی۔ لغت کی زیر باری، لغت پر اعتراضات عزیز رشتے داروں کی بیماریاں، اموات، خود کی پیرانہ سالی نے امیر کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا۔ الغرض ۱۸۹۱ء سے ۱۸۹۳ء کا عرصہ تک وہ اس قسم کے مسائل و مصائب سے شدید دوچار رہے۔ جس میں کی تمام تر کیفیات ان کے مکاتیب میں جابہ جا ساتھ ملتی ہیں۔ ۶/اگست ۱۸۹۲ء کا خط ملاحظہ کیجیے۔ جس میں ان کی زندگی کی ایک جھلک ملتی ہے:

> ''پیارے کوثر! مجھے بیماریاں و بیمارداریاں خصوصاً اور مکروہات دنیاوی عموماً نہیں چھوڑتے کہ میں احباب سے سرخرو ہوں۔۔۔ کتاب لغت (''امیر اللغات'') کی بدولت زیر باری حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ خدا رحم فرمائے۔ پیشاب کا مرض سخت مکلف ہے۔ چوکی پر جاتے جاتے پاؤں تھک جاتے ہیں اور ہر بار رک رک کر ہوتا ہے۔ دیر ہوتی ہے تو عسر بول بڑھ جاتا ہے۔ آنکھوں کو جب سے روگ لگا ہے۔ تب سے لکھنا اور کتاب دیکھنا گویا چھوٹ ہی گیا ہے۔ دوسرے کی محتاجی اور زیادہ مکلف ہے اور اکثر ہرج بھی ہوتا ہے۔ اب دو سطریں لکھیں اور آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کڑوانے لگیں۔ بصارت میں بھی کمی ہونے لگی''۔ ۵۹

مذکورہ خط میں امیر نے اپنی جو حالت لکھی، اس میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔ لیکن آفرین کہ مقام ہے کہ اس خستہ حالی میں بھی کا شاگردوں کا خیال جاں گزین تھا۔ ۱۴/نومبر ۱۸۹۱ء کے خط میں نعیم الحق آزاد کو رقم طراز ہیں کہ: ''مجھی غزلیں آئیں۔ بیماری اور بیماروں کی پرستاری کی حالت میں دیکھیں۔ ماشاء اللہ طبیعت آپ کی اچھی ہے''۔ ۶۰ حالات کے سبب سے شاگردوں کو کلام بھیجنے میں اکثر تاخیر ہو جاتی تھی۔ تو بعض شاگرد ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ جیسے حکیم عبدالکریم برہم۔ ملاحظہ کیجیے امیر کس محبت سے مناتے ہیں اور غزلیں اصلاح کر کے بھیجتے ہیں:

> ''یہ غزلیں جواب آپ نے بھیجیں باوجود تغیر حالات اور کمزوری طبیعت کے دیکھ کر بقدر ضرورت بنائیں''۔ ۶۱

> ''غصے میں ترے میں نے عجب لطف اٹھایا۔ اب تو عمداً بھی تقصیر کروں گا۔ تمھاری تحریر آئی اسی وقت غزل دیکھی۔ بہت اچھے اچھے شعر ہیں''۔ ۶۲

۱۲؍اپریل ۱۸۹۳ء کے خط میں کوثر خیر آبادی کو نہایت عاجزی اور انکساری سے رقم طراز ہیں کہ:

''آپ سے مجھ کو بہت ہی ندامت ہے کہ باوجود آپ کی محبت اور خصوصیت کے میری طرف سے خدمت گزاری میں نہایت کمی ہوتی ہے بلکہ ہوتی ہی نہیں۔ یہ دونوں غزلیں جو آخر میں آئیں ان میں ایک گیا کے مشاعرے کی ہے۔ دوسری ''گل چیں'' کی طرح میں۔ ''گیا'' کا مشاعرہ تو اب ہو ہی گیا۔ ''گل چیں'' میں البتہ وقت باقی ہے۔ اسی نظر سے میں نے گل چیں کی غزل دیکھی ۰۰۰ آپ سے میں اپنی کم خدمتی کی معافی چاہتا ہوں''۔ ۶۳

امیر کے مکتوبات اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ وہ شاگردوں سے بے حد لاڈ کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ سے اکثر شاگرد بار بار ناراض ہوتے اور امیر ہر بار عاجزی اور انکساری سے معذرت خواہ۔ ۹؍اگست ۱۸۹۳ء کے خط میں امیر، برہم سے پھر معذرت چاہتے ہیں: ''میں سخت نادم ہوں کہ نہ آپ کی غزل دیکھ سکا نہ خط کا جواب لکھ سکا ۰۰۰ غزل دیکھ کر وقت پر نہ بھیج سکنے کی آپ سے معافی چاہتا ہوں''۔ ۶۴ اسی طرح حکیم کوثر خیر آبادی سے بھی امیر عذر خواہ نظر آتے ہیں: ''پریشانیوں کے ہجوم سے آپ کی غزل اور جواب خط نہ بھیج سکا۔ انفعال کے ساتھ عذر خواہ ہوں''۔ ۶۵ ایک موقعے پر امیر، برہم سے ناراض نظر آتے ہیں اور سخت لہجہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ برہم، امیر کو بہت زچ کیا کرتے تھے۔ نافرمانی کا عنصر اس کے مزاج میں بہت تھا۔ پہلی بار امیر کا تند و تیز انداز ملاحظہ کیجیے۔ امیر کے تند و تیز لہجے کی بھی اپنی ایک شان ہے:

''میں جس حال میں ہوں وہ مشغلہ شعر و سخن کے بالکل مخالف ہے۔ محض تمھاری خاطر سے تمھاری غزلیں دیکھیں ہیں ۰۰۰ تم پہلے مجھے مطمئن کر دو پھر جتنا کلام چاہو بھیجو۔ حکیم صاحب حکمت کی باتیں تم کو بہت آتی ہیں۔ کام کی بات ایک نہیں آتی۔ سچی بات لکھی ہے۔ برہم نہ ہو جانا''۔ ۶۶

امیر کی اس ناراضگی میں بھی بے زاری یا نفرت کا عنصر نظر نہیں آتا۔ بلکہ امیر ڈانٹنے کے بعد بھی اس فکر میں ہیں کہ برہم کہیں ناراض نہ ہو جائے۔ یہی وہ انداز ہے جسے امیر کا لاڈ لکھا گیا ہے۔

(۷)

امیر ایک محتاط محقق، ذمے دار استاد، ماہر زبان، اعلیٰ لغت نویس اور بلند پایہ شاعر تھے ان تمام خوبیوں نے انھیں اپنے دور کا ایک معتبر اور پروقار عالم بنا دیا تھا۔ امیر کے شاگردوں میں یوں تو بہت سی خوبیاں ہیں جن پر ہم بعد میں اظہار خیال کریں گے۔ اصلاح کے حوالے سے ان کا ایک اصول پیش کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہے انتخاب کلام۔ جس کی امیر اپنے خطوط میں بار بار تنبیہ کرتے ہیں۔

امیر کا اصول یہ تھا کہ شاگرد اپنا جو کلام اصلاح کے لیے پیش کرے، پہلے خود اس کا انتخاب کرے اس سے وہ کئی مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔

۱۔ شاگرد میں چھپی ہوئی ناقدانہ صلاحیتوں کو بیدار کرنا۔

۲۔ جو معمولی کلام ہو شاگرد اپنی فکر سے اسے خود مسترد کر دے۔

۳۔ اصلاح میں بہتر شعر کی اصلاح کی جا سکے۔

۴۔ کم وقت میں زیادہ اشعار کو بنایا جاسکے۔

امیر خود بھی اپنے کلام کے انتخاب پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ داغ نے بھی اپنا کلام انتخاب کے لیے ان کے پاس بھیجا۔ امیر اسی بابت رقم طراز ہیں کہ:

> ''جو شعر میرے نزدیک ہر طرح عیب سے پاک اور آپ کے رتبے پر پھبتے ہوئے ہیں ان کو انتخاب میں لوں اور جو شعر کہ ان میں مضامین تو تازہ ہیں، مگر نظرِ دقیق ان کو کسی عیب سے پاک نہ دیکھے ان کو انتخاب سے چھوڑ دوں اور کچھ اشارہ ان عیوب کا لکھ کر آپ کو مطلع کروں''۔ ۶۷

امیر کا یہ مکتوب کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ خاص کر انتخابِ کلام سے متعلق اس میں کئی بصیرت افروز خیال ملتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ انتخابِ کلام کرتے وقت پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ شعر فنی اور فکری اعتبار سے اعلیٰ پائے کا ہے یا نہیں۔ صرف اعلیٰ پائے کا شعر انتخاب کرنا چاہیے۔

۲۔ وہ شعر انتخاب میں لینا بہتر ہوتا ہے۔ جو شاعر کی عمر اور اس کی معاشرتی رتبے کے مطابق ہو۔ جیسا کہ امیر نے زاہد حسین زاہد کو اصلاح دیتے وقت ٹوکا تھا کہ: ''چشم بددور ابھی تمھارا آغازِ شباب ہے۔ بڑھاپے کے مضمون کا ابھی کیا موقع''۔

۳۔ انتخابِ کلام میں ان اشعار کو چھوڑ دینا چاہیے۔ جس میں فنی سقم پایا جائے۔ بے شک خیالات نئے ہوں۔

انتخابِ کلام سے متعلق یہی وہ نکات ہیں، جن کی بابت امیر اپنے شاگردوں کو بار بار متوجہ کرتے تھے۔ بعض مواقع پر، جب شاگرد انتخاب کیے بغیر کلام بھیج دیتے، تو امیر کبھی کبھی سزا کے طور پر کلام نہیں دیکھتے اور نہایت عمدگی سے کہ شاگرد پر گراں بھی نہ ہو، ٹوک دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ برہم کے نام مکتوب میں ہے کہ: ''کبھی تمھارا مختصر و منتخب کلام آتا تو باانہماک کے دیکھنے کا قصد کرتا''۔ ۶۸ کچھ کچھ یہی بیان کوثر خیرآبادی کے نام خط میں بھی ملتا ہے:

> ''سب کام چھوڑ کر غزلیں دیکھیں۔ بنانا تو کہاں ہوسکتا ہے، ایک دو جگہ عیوب پر آگاہ کر دیا۔ ایک دو جگہ آہستہ آہستہ والی غزل میں نیا بھی بتا دیا اور انتخاب کو صاد کر کے وسیم کو غزلیں دے دیں کہ لکھوا کر شاعر کو آج ہی بھیج دیں''۔ ۶۹

اکثر شاگرد ابتدائی کام کی ذمہ داری بھی امیر پر ڈال دیا کرتے تھے۔ اس صورتِ حال کے باعث ان شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیر سے ہوتی تھی۔ امیر تلامذہ کی اس عادت سے پریشان تھے۔ لیکن اس کے باوجود حوصلہ شکنی نہیں کرتے۔ البتہ تنبیہ ضرور کرتے تھے۔ اس صورتِ حال کا تفصیل سے علم، زاہد حسین زاہد کے نام مکتوب میں ہوتا ہے:

> ''آپ کی غزل دیکھنے میں جو دیر ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ کی غزلیں طویل ہوتی ہیں۔ جو کچھ آپ کہتے ہیں سب لکھ دیتے ہیں۔ انتخاب نہیں کرتے۔ میرے نزدیک مناسب ہے کہ آپ مکرر سہ کرر، نظر ڈال کر شعر منتخب کر لیا کریں۔ تاکہ مجھے آسانی ہو''۔ ۷۰

مکتوباتِ امیر کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ امیر اپنا کلام انتخاب کرنے کے بعد، اسے کسی شاگرد کے حوالے کر دیتے تھے کہ اب وہ انتخاب کرے۔ امیر کے ایک خط سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے ''گل چیں'' کے لیے احباب کے اصرار سے اشعار کہے تھے۔ لیکن انھیں دفتر ''گل چیں'' بھیجنے سے پہلے ممتاز علی آہ کو انتخاب کے لیے دیے:

''میں نے بعض احباب کے اصرار سے غزل کہی ہے، اب تک دفتر گل چیں میں نہیں بھیجی ... اس میں سے بار بار انتخاب کر کے، ممتاز نے صرف پچیس شعر کی دو غزلیں رکھی ہیں اور یہی رائے ہے کہ اسی قدر گلدستے میں چھپنے کو بھیجی جائیں مگر ان کو بھی زیادہ سمجھتا ہوں''۔ ۱ے

امیر شاگردوں کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ وہ ان پر اس طرح اعتبار کرتے تھے جس طرح اپنی اولاد پر۔ یہی وجہ تھی کہ جب شاگرد امیر کے کلام کے کسی کمزور پہلو کی طرف اشارہ کرتے، تو امیر اسے اہمیت دیتے ۔ اسی بابت ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ:

''اگر کبھی کوئی شاگرد بھی آپ کے شعر میں شبہ کر کے کچھ عرض کرتا ہے تو محض بہ نظرِ احتیاط، ردوبدل فرما دیتے''۔ ۲ے

آہ کے بیان کی تصدیق، مذکورہ بالا خط کے اقتباس سے بھی ہوتی ہے کہ ممتاز پچیس پچیس اشعار کی دو غزلیں رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن امیر اس تعداد کو بھی زیادہ لکھ رہے ہیں۔ باوجود اپنی ناپسندیدگی کے امیر نے ممتاز کی رائے کو اہمیت دی اور فیصلے کو قبول کر لیا۔

شاگرد، امیر کو جو کلام اصلاح کے لیے بھیجتے تھے اس حوالے سے ایک اور پہلو امیر کے خطوط میں ملتا ہے۔ جو ان کے مزاج اور ذوق کا آئینہ دار بھی ہے۔ امیر نفاست اور اعلیٰ معیار کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ چاہے وہ کلام ہو یا لباس یا زندگی کے دیگر برتاوے۔ شاگردوں سے بھی یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ بھی ہم ہنر ہوں۔ یہاں تک کہ اصلاح کے لیے جو غزل ارسال کی جاتی، امیر کی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی عمدہ کاغذ پر ہو۔ نعیم الحق آزاد کو لکھتے ہیں کہ: ''کاغذ آپ نے بہت بردرا اور کھرا اختیار کیا ہے۔ آئندہ سے سفید اور چکنے کاغذ پر لکھا کیجیے''۔ ۳ے شاگردوں کے ساتھ امیر کا رویہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کسی کو بھی خالی چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ امیر کو اپنی حیثیت اور رتبے کا اندازہ تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ برصغیر میں طرز جدید کے نت نئے انداز، آنے والے وقتوں میں اسلاف کی عمدہ روایت کو بھی بہا کر لے جائیں گے۔ چناں چہ انھوں نے اپنی شخصیت کے بڑے پن اور اپنے علمی رتبے سے شاگردوں کو شعوری طور پر متاثر کیا اور ایک ایسی نسل تیار کی جس نے لگ بھگ پچاس سال تک ان علمی و ادبی اور تہذیبی روایات کو برقرار رکھا جو امیر کو عزیز تھیں۔ لیکن اس کام کے لیے امیر کو کتنے جتن کرنا پڑے اس کا مکمل ریکارڈ امیر کے مکتوبات میں موجود ہے۔

اب امیر مینائی کے طرزِ اصلاح کے نمونے پیش کیے جاتے ہیں۔ جس میں سوائے مسیح کے تمام کے تمام نمونے زاہد حسین زاہد کے نام خطوط سے مستفاد ہیں۔ اس موقعے پر صرف ایک شاگرد کو شامل کیا گیا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ امیر کے مطبوعہ خط سب سے زیادہ زاہد کے نام ہیں۔ دوسرے یہ کہ اصلاح کے نمونے بھی سب سے زیادہ زاہد کے خطوط میں ملتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ اس شاگرد کے یہاں اصلاح کا ایک تسلسل ہے۔ ہر موقعے پر ایک نئی بات ملتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس طریقے سے زیادہ نتائج حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

(۸)

امیر کی طرز اصلاح کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے۔ جو ''زمانہ'' کانپور میں مسیح نے شائع کرایا تھا۴ے یہاں یہ صراحت

موجود نہیں ہے کہ یہ کس کے کلام پر ہے۔لیکن چوں کہ دل چسپ ہے۔اس لیے ملاحظے کے لیے پیش کی جاتی ہیں:

کیا حسد تھا کہ رقیبوں نے پس مرگ کبھی ہڈیاں میری، سگِ یار کو کھانے نہ دیا
کیا حسد تھا کہ رقیبوں نے پس مرگ کبھی استخوان میرا، سگِ یار کو کھانے نہ دیا

اصلاح: ہڈیاں جمع مؤنث۔فعل واحد مذکر۔

ہجر میں جو دیدۂ تر ابر سا برسا کیسا یہ دل بیتاب بھی بجلی ہی سا تڑپا کیسا

اصلاح: اس مطلع میں ایطا ہے۔ایک مطلع ایسا کہنا چاہیے کہ ایک قافیہ اس میں عربی یا فارسی کا ہو تو ایطا سے بچ جائے۔

ہزاروں دل ہیں تیرے غم کی چوٹ کھائے ہوئے نہ اک ہمیں ہیں فقط آہ دل دکھائے ہوئے
ہزاروں دل ہیں تیرے غم کی چوٹ کھائے ہوئے نہیں ہیں ایک ہمیں تیرے دل دکھائے ہوئے

اصلاح، نہ کی جگہ نہیں۔

جو آج کاکلیں اپنی ہیں وہ بنائے ہوئے مرے ہی سر پہ تو ہیں وہ بلا یہ لائے ہوئے

اصلاح: اشارہ مصرع اول میں معشوق کی طرف ہو چکا ہے۔

جو آج کاکلیں۔الخ
کچھ انتہا ہے مری سخت جانی کی اللہ مرے ہی سر پہ تو ہیں یہ بلائیں لائے ہوئے
پڑا تڑپتا ہوں چرکے پہ چرکے کھائے ہوئے

اصلاح: ترکیب کی یائے تحتانی کا تقطیع سے گرنا، نہ چاہیے۔

کچھ انتہا ہے بھلا میری سخت جانی کی پڑا تڑپتا ہوں۔الخ
جو قتل نامہ پہ میرے نہ مہر کی اس نے نگار ہاتھوں میں مہندی تھا کیا لگائے ہوئے

اصلاح: پاؤں میں مہندی لگی ہونا محاورۂ کنایہ معذوری رفتار سے ہے۔ہاتھوں میں مہندی لگائے ہونا اگرچہ مانع کار ہے مگر محاورہ نہیں ہے۔۴ے

اسی نوعیت کی اور بھی اصلاحیں ''مکاتیب امیر مینائی''، ''مشاطۂ سخن'' جلد اوّل ۵ے ''مشاطۂ سخن'' جلد دوم ۶ے، امیر مینائی'' ۷ے، ''حیات الشعراء'' ۸ے اور ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ'' ۹ے میں ملتی ہیں۔جس سے امیر کے طریقہ اصلاح کی وضاحت ہوتی ہے۔لیکن ذیل میں زاہد حسین زاہد کے کلام پر امیر کی اصلاح کے جو نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔یہ ''مکاتیب امیر مینائی'' اور ''مشاطۂ سخن'' حصہ دوم میں موجود ہیں۔

امیر خط کے ذریعے شاگردوں کو اصلاح دیتے تھے۔اس کے دو طریقے تھے پہلا یہ کہ اصلاح اسی کاغذ پر کر دیا کرتے تھے۔جس پر شاگرد کی غزل تحریر ہوتی۔اس سے متعلق دیگر امور خط میں تحریر کیا کرتے تھے۔ جب کہ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ اصلاح اور دیگر معلومات رمشورے بھی اسی کاغذ پر لکھ دیتے تھے۔جس پر کلام ہوتا تھا۔ذیل میں جو نمونے پیش کیے جا رہے ہیں۔وہ پہلے طریقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ہمارے خیال میں اس سے امیر کی اصلاح کی زیادہ وضاحت ہوتی ہے۔چنانچہ خط کا متن ''مکاتیب امیر مینائی'' سے اور اصلاح کا نمونہ ''مشاطۂ سخن'' سے مستفاد ہے۔

(۱) مکتوب مورخہ ۱۲؍نومبر ۱۸۸۹ء۔

''غزل آپ نے خوب کہی ہے۔ ماشاءاللہ ثم ماشاءاللہ۔ زمین بھی نئی تھی۔ شعر بھی مزے کے نکلے۔ اپنا حق ثابت کرنے کو میں نے کچھ دخل دیا ہے''۔ ۸۰

زاہد:

''گیا جو وقت اسے سمجھو گیا۔ پھر کر نہیں آتا
نپاؤ گے نپاؤ گے کہیں دیکھو کہیں ڈھونڈھو

اصلاح:

گیا جو وقت وہ پھر کر نہیں آتا نہیں آتا
نپاؤ گے نہ نپاؤ گے۔ الخ

مصرع ثانی میں جو (نپاؤ گے) کی تکرار مقید تاکید ہے اس کے مقابل مصرع اولیٰ میں (نہیں آتا) کی تکرار زیادہ مناسب و موزوں ہے''۔ ۸۱

(۱۱) مکتوب مورخہ ۲۶؍جولائی ۱۸۹۱ء۔

''سلام و نیاز کے بعد التماس ہے کہ ماشاءاللہ کیا اچھے اچھے شعر آپ نے کہے ہیں۔ خدا آپ کی عمر و اقبال میں برکت دے۔ غزل اور خط ایک ہی کاغذ پر ہے خط کا واپس کرنا بہت شاق ہوتا ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ آئندہ ایسی پیاری چیز [واپس] لینے کا ارادہ نہ کیا کیجیے۔

انشا کی غزل کے سوا پہلا لیلا، کے قافیوں میں، میں نے کوئی غزل اب سے پہلے نہیں دیکھی۔ کیا عمدہ غزل آپ نے کہی ہے۔ آپ کی طبیعت کا حسن ہر شعر سے ظاہر ہے۔ افسوس ہے کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے قاصر رہتا ہوں ورنہ آپ کا شوق چمک جاتا۔ پیرانہ سالی کے علاوہ اور بہت سے اسباب ہیں۔ جو مجھ کو شاعری کے طرف متوجہ ہونے سے روکتے ہیں۔ چھیلا کا قافیہ کہنے کا ہے۔ شوخ لفظ ہے ضرور لکھیے ۰۰۰''۔ ۸۲

زاہد:

بدن میں آگ بھڑک جائے جس سے وہ شے لا
دو آتشہ کوئی کھنچوا کے ساقیا مے لا

اصلاح:

بدن میں الخ
دو آتشہ کوئی سر جوش ساقیا مے لا

ترکیب ذرا اور تیز ہوگئی''۔ ۸۳

(III) مکتوب مورخہ ۲۰ جولائی ۱۸۹۱ء۔

''آج ایک خط ملا جس میں یہ غزل تھی جوشِ نقشِ پا (مشاطۂ سخن حصہ دوم ص ۵۹ میں ''ہوشِ'' نقشِ پا ہے۔) ہجومِ انتشار میں غزل دیکھی اور اپنے گمان میں بنائی۔ واقعی خدا جانے بگاڑی ہے یا بنائی ہے۔ جو الفاظ کاٹ دیے کاٹنے کے وجوہ آپ غور سے دیکھ لیجیے گا۔ زمین مشکل اور پامال ہے شعر آپ نے اچھے اچھے کہے ہیں۔ میں نے جن شعروں پر صاد کیے ہیں۔ وہی رکھیے گا۔ مجھے فرصت و اطمینان نہیں ہے۔ ورنہ وجوہ بھی حواشی پر لکھ دیتا۔ ماشاء اللہ آپ خود ذہین ہیں۔ سمجھ لیں گے۔ سبحان اللہ کیا غزل کہی ہے اور کس ٹیڑھی زمین میں۔ اللہ تعالیٰ آپ کے عمر و اقبال میں برکت دے اور خیال میں اور وسعت''۔۴۸

''زاہد:

یہ ضعف ہے کہ پاؤں مرا اب تو راہ میں
اٹھتا ہے ہاتھ رکھ کے سر دوشِ نقشِ پا

اصلاح:

یہ ضعف ہے کہ پانو مرا اب قدم قدم
اٹھتا ہے۔ الخ

تناسب الفاظ کے علاوہ قدم قدم دوسرے کے دوش پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا غایتِ ضعف کو ظاہر کرتا ہے۔

زاہد:

روزی گرے پڑوں کو پہنچتی ہے ان کے گھر سے
ہے میرے آبلوں کا لہو نوش نقشِ پا

نوش کا قافیہ خوب کہا ہے۔ ماشاء اللہ اور مصرع بھی خوب لگایا سبحان اللہ۔ خورونوش زیادہ مستعمل ہے۔ فقط نوش اس محل پر زبان نہیں اور کوئی عیب بھی نہیں۔ مضمون بہت اچھا ہے اور معناً درست ہے۔ لہٰذا رہنے دیجیے۔

زاہد:

زاہد نے نقشِ پائے صنم کو مٹا دیا
کچھ ایسے ہوش اڑے نہ رہا ہوشِ نقشِ پا

اصلاح:

زاہد نے نقشِ پائے صنم کو مٹا دیا
کچھ شوقِ سجدہ میں نہ رہا ہوشِ نقشِ پا

نقشِ پائے صنم کو مٹانے کی علت پوشیدہ تھی۔ شوقِ سجدہ نے ظاہر کر دیا اور احترام نقشِ پا اور پرستش بے

خودی، شوق سے ثابت ہوگئی''۔۸۵

۱۷ مکتوب مورخہ ۳۰ جون ۱۸۸۲ء

''پیارے زاہد۔ زہد مشرب، جام شراب، والی غزل اس وقت میں نے دیکھی اور مست ہو کر جھومنے لگا۔ مشکل زمین تھی مگر تم نے بہت اچھے اچھے شعر کہے اللہ تمھاری عمر میں برکت دے اور اقبال بڑھائے''۔۸۶

زاہد:

ہاتھ تک اس کے جو ہو دسترس جام شراب
کیوں نہ اس ہاتھ سے ہو پھر ہوس جامِ شراب

اصلاح:

ہاتھ تک۔ الخ
کیوں نہ مے خواروں کو ہو پھر ہوسِ جامِ شراب

دوسرے مصرعے میں (ہاتھ سے) کی جگہ مے خواروں بنا دیا ہے۔ کیوں کہ لطف اسی قدر مے نوشی میں ہے کہ جب جام شراب کو یہ فخر حاصل ہو کہ اس کے ہاتھ تک پہنچا ہے۔ تو ایسے جام شراب کی ہوس، مے خواروں کو کیوں نہ ہو اور جب (اس ہاتھ) کہیے گا تو جام شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا کیا فائدہ رہے گا۔

زاہد:

قافلے ہوش کے رخصت ہوے مے خواروں سے
سب جو میخانے میں کھڑکا جرسِ جام شراب

اصلاح:

قافلے ہوش کے۔ الخ
سن کے میخانے میں شورجرسِ جام شراب

جرس کا کھڑکنا فصحا نہیں کہتے اس لیے بدلا گیا''۔۸۷

۷۔ مورخہ ۱۲ر فروری ۱۸۹۳ء

''غزلیں دیکھیں بقدر ضرورت بنائیں۔ بارک اللہ ایسی پتھر زمین میں کیا نازک شعر کہے ہیں اور کتنے کہے ہیں کہ جی ہی جانتا ہے اگر اجازت دو اور چاروں غزلیں لکھوا کر مجھے بھیج دو تو میں ''ریاض الاخبار'' وغیرہ میں چھپوا دوں تا کہ لوگ دیکھیں کہ ایسی پامال اور سنگلاخ زمینوں میں اب بھی ایسے ایسے پھولنے پھلنے والے موجود ہیں''۔۸۸

زاہد:

ساقیا لاکھ پلا جام پسِ جامِ شراب
نہ مٹے گی نہ مٹے گی ہوسِ جامِ شراب

اصلاح:

ساقیا لاکھ پلا۔ الخ
نہ مٹی ہے نہ مٹے گی ہوسِ جامِ شراب

نہ مٹے گی نہ مٹے گی، سے محض زمانہ آئندہ پایا جاتا تھا۔ اب گزشتہ و حال و آئندہ سب زمانے آ گئے۔

زاہد:

چاٹتا رہتا ہے پیالے ہی کو مے خانے میں
بن گیا شیخ تو بالکل مگسِ جامِ شراب

اصلاح:

کیا بری چاٹ ہے چاٹے ہی چلا جاتا ہے
بن گیا شیخ۔ الخ

مصرعۂ اوّل میں پیالے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا بندش بھی ذرا چست ہو گئی''۔۸۹

VI۔ مورخہ ۳۰ رجون ۱۹۹۳ء

''تم نے تو 'فرسِ جامِ شراب' اور قفسِ جامِ شراب، میں دریا بہا دیے۔ اب ذرا طبع رواں کو روکو، فرصت کے وقت دو دو چار چار شعر کر کے دیکھ لوں گا۔ خاطر جمع رکھو۔ مکرر یہ کہ اب قفسِ جامِ شراب سے اپنے مرغ فکر کو رہائی دو۔ ہر زمین میں اشعار کی تعداد غزل سے نہ بڑھ جانا چاہیے۔ ہر زمین کا ایک پیمانہ ہوا کرتا ہے۔ جہاں اس سے بڑھ جاتی ہے۔ بدنمائی آ جاتی ہے اور یہ بھی یاد رکھو کہ سنگلاخ زمینوں میں لاکھ کوشش کی جائے مگر مزے دار شعر ایسے نہیں ہوتے کہ سننے والے چٹخارے بھرنے لگیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تمھارا سا مزے دار شاعر اپنا وقت کسی شور زدہ حاصل زمینوں میں صرف نہ کرے۔ لوچ دار زمین اختیار کرو، دیکھو کیا مزا آتا ہے۔ تمھاری غزلیں بہت اچھی ہو گئی ہیں اور کلام میں ماشاء اللہ صفائی آ گئی ہے۔ اب اس زمین کو بھی چھوڑ دو اور ہمیشہ کے لیے ایسی زمینوں کو ترک کرو''۔۹۰

''زاہد:

کم نہیں دُردِ مے صاف سے ساقی ہرگز
شیشۂ قلب پہ زنگِ ہوسِ جامِ شراب

اصلاح:

دردِ مے سے عالمِ مستی میں نظر آتی ہے
شیشہ قلب پہ گردِ ہوسِ جامِ شراب

مےِ صاف میں ذرد کہاں اور زنگ کو آئینے سے علاقہ ہے نہ کہ شیشے سے''۔

زاہد:

مست و مدہوش سے امیدِ ہدایت عبث ہے
راہ نما کب ہے صدائے جرسِ جامِ شراب

اصلاح:

کیا خراباتِ نشینوں سے ہدایت کی امید
راہ نما کب۔ الخ

جام تو دوسروں کو مست کرنے والا ہے خود مست و مدہوش نہیں''۔91

VII۔مکتوب مورخہ ۲۵؍اگست ۱۸۹۳ء

''مدت کے بعد آج اس کی نوبت آئی کہ میں نے آپ کی یہ غزلیں دیکھیں اور آپ کی طباعی اور زور آوری فکر پر آفرین کہی۔ خداوند تعالیٰ عمر و اقبال میں برکت دے۔

۰۰۰غزل میں شعر اس قدر گنجان اور جگہ تنگ کر کے آپ لکھتے ہیں کہ اصلاح دینے اور وجوہ لکھنے میں ذرا دقت ہوتی ہے۔ آئندہ سے واضح ہونا چاہیے۔ چند شعروں پر بے اختیار قلم سے صاد نکل گیا ہے۔ آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہی چند شعر انتخاب ہیں۔ ان غزلوں میں بہت سے شعر انتخاب ہیں''۔92

VIII۔مکتوب مورخہ ۱۳؍جون ۱۸۹۴ء

''پیارے زاہد شعر کے مشرب میں زاہد کی صفت خشک مستعمل ہے۔ مگر تمھاری نظم و نثر کی تازگی دیکھ کر روح تازہ ہو جاتی ہے اور زہد کی صفت خشک درست نہیں معلوم ہوتی۔ خدا تمھاری شیریں بیانی غذایتِ لسانی میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔ (آمین)

پیارے زاہد آگ لگی والی غزل پر مصرع لگانے کے واسطے تم نے مجھ ول جلے کو تجویز کیا۔ یہ بھی تمھاری طبیعت کی گرما گرمی کا ایک نتیجہ ہے ۰۰۰غزل کسی وقت دیکھ کر بھیجوں گا۔ سرسری نظر سے دیکھ گیا۔ اصلاح کی حاجت تو معلوم نہیں ہوتی شاید ایک آدھ جگہ کچھ ہے''۔94

زاہد:

وفورِ سوزشِ دل سے بدن میں آگ لگی
یہ آگ گھر کی جو پھیلی وطن میں آگ لگی

اصلاح:

بڑھی جو قلب کی سوزش بدن میں آگ لگی
یہ آگ گھر کی۔ الخ"۔۹۵

IX۔مکتوب مورخہ ۳۰ر ستمبر ۱۸۹۴ء۔

"بدحواسی میں غزل دیکھی۔اس سنگلاخ زمین میں ایسے شعر کہنا آپ ہی کا کام ہے"۔۹۶

زاہد:

عرق جبینِ بتِ شعلہ رنگ پر یوں ہے
عیاں ہو آگ میں جیسے طلائے خام کی بوند

اصلاح:

عرق جبینِ۔ الخ
بھڑکتی آگ میں جیسے طلائے خام کی بوند

'عیاں ہو' سے بھڑکتی میں، زیادہ گرمی وزور ہے۔

زاہد:

ہوا ہو سرد بجھے سوزِ دل شراب جلے
پڑے اگر کوئی ابر سیاہ فام کی بوند

مینہ کی بوند۔پانی کی بوند۔سب درست مگر ابر کی بوند مستعمل نہیں"۔۹۷

X۔ مکتوب مورخہ ۱۹ر ستمبر ۱۸۹۵ء۔

"ابر کی بوند بے شک شعراء نے اور شاہ نصیر اور داغ نے کہا ہے اس لیے یہ غلط نہیں کہا جاسکتا۔لیکن اپنی اپنی پسند ہے۔زمانوں پر مستعمل نہ ہونے سے میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی اور اگر آپ اپنے کلام میں لکھنا چاہتے ہیں تو چنداں مضائقہ نہیں"۔۹۸

زاہد:

جگر کو گرمیِ بنتِ عنب نے پھونک دیا
حلال کر دے گی زاہد کو یہ حرام کی بوند

اصلاح:

جگر کو گرمی۔ الخ
حلال کر گئی زاہد کو یہ حرام کی بوند

'کردے گی' کی یائے اول کا گرنا ناپسند کر کے اس کی جگہ (کر گئی) بنانا ٹھیک ہے۔اب اپنے وجدانِ سلیم سے کام لیجیے اور اس مصرعے کو یوں ہی رکھیے جیسا میں نے بنایا ہے"۔۹۹

XI- مکتوب مورخہ ۱۲؍اکتوبر ۱۸۹۵ء۔

ماشاءاللہ کیا کیا شعر کہے ہیں۔چشم بددور جس زمین میں انشاء نے چار شعر نکالے آپ نے اس میں دریا بہادیے بارک اللہ فی عمرکم''۔۱۰۰

''زاہد:

پٹک پٹک کے نہ سر عندب مر جائے
صبا قفس میں نہ پیغامِ بہمن و دے لا

اصلاح:

پٹک پٹک کے۔ الخ
صبا چمن میں نہ پیغامِ بہمن و دے لا

بہمن و دے خزاں کے مہینے ہیں شعر کے معنی اس صورت میں بھی درست ہو سکتے ہیں۔مگر موسم ہائے بہار اگر ہوتے تو وہ بلبل کی بے تابی کے واسطے زیادہ تر مناسب ہوتے۔جیسا کہ شعرا کہا کرتے ہیں۔اب بجائے قفس کے چمن کر دیا گیا ہے۔اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ بلبل جو چمن میں مصروف عیش بہار ہے۔اس کو آ کر پیامِ خزاں نہ سنا۔مبادا سر پٹک پٹک کر مر جائے''۔۱۰۱

XII۔مکتوب مورخہ مارچ ۱۸۹۶ء۔

''تمھارے ایک شعر کے معنی میں نہیں سمجھا کہ بلعم کی طرح دوش و سر کی چوٹ کیا چیز ہے۔یہ مضمون غالباً کسی قصے سے متعلق ہوگا۔جو مجھے معلوم نہیں''۔۱۰۲

زاہد:

خالق جو عمر دے تو قویٰ بھی عطا کرے
بلعم کی طرح سے نکرے دوش و سر کی چوٹ''۔۱۰۳

''زاہد:

سنگِ درِ حرم پہ اسے جا کے کیا رکھیں
جو سر کہ کھا چکا ہے ترے سنگ در کی چوٹ

اصلاح:

سنگِ درِ حرم پہ اسے کیا جھکائیے
جو سر کہ۔ الخ

رکھیں میں اب تخفیف کاف کو فصحا خلافِ فصاحت جانتے ہیں۔

XIII۔مکتوب مورخہ ۱۴؍جولائی ۱۸۹۷ء۔

''غزلیں تمھاری ابتدائی شاعری کی کہی ہوئی مل گئیں۔ان کو بھی سرسری نظر سے دیکھ کر صحیح کر دیا۔ان

کوخود بھی تم اپنے ذوق سلیم سے درست کر سکتے تھے''۔۱۰۴

''زاہد:

وہ جو رنگ رنگ کے قصر تھے وہ عمارتیں تو عجیب تھیں
وہاں صرف اب ہیں کھنڈر پڑے نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے

اصلاح:

وہ جو رنگ رنگ کے۔ الخ
کھنڈر اب وہاں نظر آتے ہیں ۔ نہ وہ نقش ہے نہ نگار ہے۔

الفاظ ہندیہ میں سے آخر کا حرف گرتا ہے۔ بیچ کا نہیں گرتا۔ فلہٰذا وہاں کی تصحیح کر دی گئی''۔۱۰۵

زاہد:

تری بات کا بُت بے وفا کوئی کیا یقین کرے بھلا
کبھی اس سے وعدہ وعید ہے کبھی اس سے قول قرار ہے

قرار بہ معنی اقرار، عربی و فارسی میں تو نہیں ملتا۔ البتہ بغیر واؤ عطف قول و قرار کو جس طرح آپ نے اردو کر لیا ہے۔ اس کا مضائقہ نہیں''۔

زاہد:

جنھیں شوق نام و نشان تھا یہی فکر تھی یہی دھیان تھا
انھیں یوں فلک نے مٹا دیا نہ نشان ہے نہ مزار ہے

اصلاح:

جنھیں شوق تھا کہ نشاں رہے کوئی یادگارِ مکاں رہے
انھیں یوں۔ الخ

اضافت کی حالت میں اعلان نون جائز نہیں۔

زاہد:

ارم ہو حرم ہو ویا دیر ہو
ہمیں صرف ذوقِ نظر چاہیے

اصلاح:

ارم ہو حرم ہو کہ بت خانہ ہو
ہمیں صرف۔ الخ

'ویا' اب بالکل متروک ہے اس جگہ صرف یا بولتے ہیں یا 'کاف' سے کام لیجیے جو 'یا' کے معنی میں آتا ہے۔

زاہد:

حقیقت ہی ہے فی الحقیقت مجاز
مگر دیدۂ حق نگر چاہیے
نگاہِ حقیقت مگر چاہیے

یہ دونوں مصرعے اچھے ہیں۔ مگر تناسب الفاظ کے لحاظ سے مصرعۂ اوّل، اوّل ہے۔ ۱۰۶

''یہ شعر مجھ کو جی سے پسند آیا بارک اللہ خوب خوب کہا ہے۔

وہ آنکھوں میں ہے پتلیوں کی طرح
مگر دیکھنے کو نظر چاہیے'' ۱۰۷

XIV۔ مکتوب مورخہ ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۷ء۔

''اب غزل دیکھنے کی نوبت آئی۔ آپ کی قوتِ فکر اسی سے پیدا ہے کہ ایسی پامال زمین میں سوا سو شعر آپ نے موزوں کیے ہیں۔ اللّٰھم زد فزد۔ میں نے بقدر ضرورت ایک آدھ جگہ محو اثبات کیا اور جو شعر قابلِ انتخاب نظر آئے ان پر صاد کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ جو اشعار دائرۂ تغزل سے باہر نہیں ان پر ''بت'' بنا دی ہے۔ یہ اشعار بھی سب غزل میں رکھنے کے قابل ہیں۔ باقی اشعار کے رکھنے میں اختیار ہے''۔ ۱۰۹

XV۔ ۱۲ر مارچ ۱۸۸۹ء، ص ۲۳۴۔

''استفتے سے متعلق میں نج کے طور پر آپ کو اپنا مشرب لکھتا ہوں کہ میں ہدفِ سہام ملامت ہونے کی طاقت نہیں رکھتا اور تمام عمر تجربہ ہوا کہ اول مناظرہ جو احقاقِ حق سے عبارت ہے ہوتا ہی نہیں اور بالفرض ابتداء میں کہیں ہوتا بھی ہے تو انجام کار مکابرے اور مجادلے کی طرف کھنچتا جاتا ہے۔ لہٰذا میں کبھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا اور کسی استفتے پر فتویٰ نہیں دیتا۔ البتہ میرے سچے دوست جو بات مجھ سے پوچھتے ہیں۔ اپنی رائے ناقص کے موافق ان کو بتا دیتا ہوں۔ اسی مشرب کی بنا پر میں تاریخ محوث عنہ سے بحث نہیں کرتا اور آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بے فائدہ یہ دردسر مول نہ لیا کیجیے۔ جب خصوصیت مباحث متعلقہ تاریخ سے قطع نظر کی گئی تو اب بتانے کی بات یہ رہی کہ مشتری ستارہ مذکر ہے یا مونث واضح ہو کہ یہ ستارہ مونث ہے اور جہاں کہیں سخن دانوں اور سخنوروں نے استعمال بہ تذکیر کیا ہے وہاں ستارہ مقصود نہیں ہے۔ جس کو مشتری سے تشبیہ دی ہے۔ جیسے ناسخ کے اس مطلع پر شعر:

بلبل ہوں بوستان جنابِ امیر کا
روح القدس ہے نام مرے ہم صفیر کا

ان کے شاگردِ رشید مرزا محمد رضا برق نے جو مصرعے لگائے ہیں۔ اس میں قُمری کو جس کی تانیث میں

کسی کو اختلاف نہیں۔ تذکیر استعمال کیا ہے۔ تو بات یہی ہے کہ وہاں قمری طائر مقصود نہیں ہے وہ تضمین یہ ہے:

پروانہ ہوں ازل سے سراجِ منیر کا
قمری ہوں سروِ باغ علی کبیر کا
میں نغمہ سنج ہوں چمن بے نظیر کا
بلبل ہوں بوستانِ جناب امیر کا

جہاں تاریخ میں زہرہ کے ساتھ مشتری کا لفظ آئے گا۔ وہاں مشتری سے دولھا ہی مقصود ہوگا۔ جیسے قمر؛ سے برق کے شعر میں عاشق یا خود متکلم و مصنف مراد ہے۔ زیادہ آپ سے ذکی اور فہمیدہ سخنور کو لکھنے کی حاجت نہیں۔ اگر تتبع کلام اساتذہ سے آپ کو کوئی سند مشتری، کوکب کی تذکیر کی پایئے تو مجھے بھی لکھیے۔ بحث تمام ہوئی''۔ ۱۱۰

XVI۔ مکتوب مورخہ ۱۴؍اپریل ۱۸۹۹ء۔

''مادۂ تاریخ لفظ 'ایجاب' محض اور بجائے، قران لفظ، وصل، لانا اور سی سے معنی ایجاب وقبول اور قرانِ واجماع، لینا بہت تکلف ہے۔ اس باب میں مجھے بھی آپ کی رائے سے اتفاق کلی ہے۔ ''دامنِ گلچیں'' کی غزل دیکھی اور کمیٹی انتخاب میں منتخب ہوگئی۔ غزل آپ نے بہت اچھی کہی ہے۔ اصلاح کی فی الحقیقت ضرورت و گنجائش نہ تھی۔ بے شبہ آپ حذاقت سے غور کر کے مٹالیا کیجیے۔ اگر کبھی کوئی شعر مشکوک ہی رہ جائے تو اس کو لکھ بھیجا کیجیے''۔ ۱۱۱

''زاہد:

کیا وصف ہو اس خالقِ بے چون و چرا کا
یاں ورد ہے سبحانک لاعلم لنا کا

یاں اور واں یا یہاں اور وہاں بروزن فاع، فصحائے لکھنؤ اب نہیں لکھتے لیکن آپ چوں کہ دہلی کی زبان پسند کرتے اور اسی کا اتباع کرتے ہیں اس لیے آپ لکھیے:

زاہد:

واقف نہیں کوئی مرے اندازِ بیاں سے
جو ہے وہ یہاں بولتا ہے اپنا ہی بھاکا

اصلاح:

واقف نہیں۔ الخ
ہر شخص یہاں بولتا ہے اپنی ہی بھاکا

بیان و ترکیب ذرا صاف ہوگئی''۔ ۱۱۲

''لفظ' ساگا'' کی اصل 'ساگھا' بمعنی جنگ وجدل ہے۔ میر تقی میر مرحوم کے شعر میں بھی یہی معنی ہیں۔ قدما کے سوا متوسطین ومتاخرین کے کلام میں یہ لفظ دیکھا نہیں گیا۔ 'بھاگا' اصل میں 'بھاشا' ہے اور ہندی میں 'شا' اور 'کھا' کا بدلا ہوتا ہے۔ اردو میں فصحا کی زبان پر بیشتر 'بھاکا' اور کمتر 'بھاشا' مستعمل ہے''۔۱۳؎

(۹)

امیر اپنے دور کے ایک باشعور استاد تھے۔ وہ تعلیمی نفسیات سے بھی آگاہ تھے اور علم کی فلاسفی سے بھی، وہ ادبی تاریخ سے بھی آشنا تھے اور ادبی رویوں سے بھی۔ وہ ایسے استاد تھے، جن کا طریقہ یا انداز، سماجی کارکن جیسا تھا۔ گویا امیر اپنی تمام علمی، ادبی اور سماجی حیثیتوں کے ساتھ شاگردوں سے تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شاگرد ان کا گرویدہ تھا۔ بشیر ملیح آبادی، امیر کے علاوہ داغ سے بھی اپنے کلام پر اصلاح لیتے تھے۔ لیکن امیر کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ چناں چہ وہ بشیر ملیح آبادی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''مجھے بشرطِ خیریت وامکان آپ کی خدمت گزاری اور آپ کی خوشی سے کام ہے۔ اس سے کچھ غرض نہیں کہ آپ شاگرد کس کے کہے جائیں''۔۱۴؎

زاہد حسین کو رقم طراز ہیں کہ: ''آپ کی عنایت وسیادت سے امید عفو جرم کی رکھتا ہوں''۔۱۵؎ ایک اور خط میں امیر کا جذبہ خدمت ملاحظہ کیجیے۔ لکھتے ہیں: ''آپ کی خدمت گزاری کو اپنا فخر سمجھتا ہوں''۔۱۶؎ ثاقب کے نام خطوط توجہ سے دیکھیے کہ ایک استاد، شاگرد سے کس عاجزی وانکساری سے مخاطب ہے۔ یہ ہے ایک سماجی کارکن کے بھیس میں چھپا ہوا ایک استاد اور ایک عالم:

''میرے دل نواز! مجھے آپ سے مطلق شکایت نہیں، بلکہ بدستور آپ کی محبت قدیمانہ پر بھروسہ ہے۔ حجاب ہے تو اپنے تساہل کی بدولت ہے اور شکایت ہے تو اپنی کم نصیبی سے ہے کہ احباب کی خدمت گزاری سے بھی قاصر رہتا ہوں۔ مکروہات کا ہجوم رہتا ہے''۔۱۷؎

امیر باوجود اپنی بیماریوں اور دیگر مصروفیات کے، شاگردوں پر خصوصی توجہ دیا کرتے تھے۔ ہر ممکن مدد کے لیے تیار رہتے اور چاہتے تھے کہ ان سے تعلق رکھنے والا ہر شخص ممتاز ہو۔ امیر کی یہ عادت ان کے صوفیانہ مزاج کی عکاسی کرتی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں صوفی سے بڑھ کر کوئی باشعور سماجی کارکن نہیں ہوتا اور کیوں کہ امیر بھی بنیادی طور پر صوفی ہی تھے۔ اسی وجہ سے کہ وہ بھی انسانیت کی خدمت میں بہت آگے تھے۔ بلاشبہ امیر، علم کی شمع جلانا بھی جانتے تھے اور طالب علم کی پیاس بجھانا بھی۔ اپنے ایک شاگرد کو لکھتے ہیں کہ:

''جو بات مجھے لکھ بھیجنے کے قابل ہو، وہ ضرور لکھیے اور حسب وعدہ ہمیشہ صلاح نیک سے شاد کام رکھیے''۔۱۸؎

امیر کے مزاج اور عادات کا مطالعہ کرنے کے بعد جب شاگردوں کے کلام پر اصلاح کا جائزہ لیتے ہیں تو وہ اپنے رویوں کی وجہ سے ایک منفرد استاد کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اس کی مثال گزشتہ صفحات میں زاہد حسین کے نام سولہ خطوط کے

وہ اقتباسات ہیں۔جن میں جابجا امیر کے علمی جوہر ملتے ہیں اور استاد کی حیثیت سے ان کی صلاحیتوں اور شاگردوں کے ساتھ برتاؤ کا پتا چلتا ہے۔

(۱۰)

امیر کا طریقہ یہ تھا کہ جو کلام اصلاح کے لیے موصول ہوتا، اسے توجہ کے ساتھ ملاحظہ کرتے اور درستی کی وجوہ بیان کرنے سے قبل کلام کے محاسن گنواتے، کلام کی خوب تعریف کرنے کے بعد دعاؤں سے سرفراز کرتے۔مثلاً ''غزل آپ نے خوب کہی ہے۔ماشاءاللہ ثم ماشاءاللہ۔زمین بھی نئی تھی، شعر بھی مزے کے نکلے''۔یا ایک اور موقعے پر لکھتے ہیں: ''ماشاءاللہ کیا اچھے اچھے شعر آپ نے کہے ہیں۔خدا آپ کی عمر و اقبال میں برکت دے''۔امیر کا یہ رویہ صرف مخصوص شاگردوں کے لیے نہیں تھا، بلکہ یہ ان کی اصلاح کے نظام کا حصہ تھا۔محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو رقم طراز ہیں:

> ''پیاری نظم ونثر نے مسرور کیا' سر کے پاؤں' بری زمین تھی۔آپ نے غزل زورِ طبیعت سے بہت اچھی کہی۔ایسی زمین میں تکلف اور بناوٹ کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔'اثر باقی' مزے کی زمین تھی، اس میں مزے کے شعر نکلے''۔۱۱۹

امیر نے اس تعریف میں نہایت خوبصورتی سے تعریفی کلمات کے ساتھ شعر کے لیے اچھی اور بری زمین کی تعریف بھی پیش کردی۔امیر کے نزدیک ایسی زمین میں جس میں، تکلف اور بناوٹ کے اشعار نکلیں، وہ بری زمین ہے۔اس لیے کہ ان اشعار کا تاثر وقتی طور پر اچھا ہوتا ہے۔ایسے اشعار مشاعرے میں پڑھے جائیں تو خوب واہ واہ ہوجاتی ہے، لیکن اشاعت کے بعد روکھے پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔اسی طرح کا ایک اور تعریفی پیرایہ ملاحظہ کیجیے امیر کس عمدگی سے شاگرد کو حوصلہ اور اعتماد دیتے ہیں:

> ''پیارے زاہد! شعر کے مشرب میں زاہد کی صفت خشک مستعمل ہے۔مگر تمھاری نظم ونثر کی تروتازگی دیکھ کر روح تازہ ہوجاتی ہے اور زہد کی صفت خشک درست نہیں معلوم ہوتی۔خدا تمھاری شیریں بیانی اور غذائیتِ لسانی میں روز افزوں ترقی عطا فرمائے۔آمین''۔۱۲۰

زاہد کے کلام سے امیر نے جو دلچسپ نکات اخذ کیے ہیں، وہ اس بات کے غماز ہیں کہ امیر، شاگرد اور اس کے کلام کا مطالعہ دقتِ نظر سے کیا کرتے تھے اور تعریف کسی نہ کسی خوبی کی بنیاد پر کرتے۔وہ خیالی یا بے جا تعریف سے گریز کرتے تھے۔ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا کہ کلام میں خوبی نہیں ہے۔لیکن کیوں کہ شاگرد ایک بڑے منصب پر فائز ہے، اس لیے اس کی بڑائی کر دی، اگر کبھی ایسی صورت آپڑتی، تو پھر تعریف شاگرد کے کسی اور کارنامے کی کرتے تھے۔مثلاً احسن اللہ ثاقب کے نام خط کو ملاحظہ کیجیے، جس میں امیر نے کلام کے بہ جائے، ان کی سعادت مندی کی تعریف کی ہے اور دعا دی ہے:

> ''اللہ آپ کی عمر میں ایسی برکت دے کہ میرے اس مطلع کے مصداق ہوجائیں۔
>
> باقی نہ کوئی دل میں الٰہی ہوس رہے
> بارہ برس کے سن میں وہ لاکھوں برس رہے''۔ ۱۲۱

ثاقب کے مقابلے میں منشی ولایت علی صفی پوری کی تعریف، ان کے کلام پر ہے اور جو ایک استاد کی طرف سے عطا کردہ سند سے کم نہیں:

''الحق آپ جو ہر قابل ہیں اور ہر رنگ میں مذاق آپ کا اچھا ہے۔کیسی کیسی مشکل زمینوں میں آپ نے نعت کی غزلیں کہیں ہیں کہ ان زمینوں میں شاعر سے عاشقانہ شعر بھی مشکل سے نکل سکتے ہیں۔ بارک اللہ عمرکم''۔۱۲۲

امیر نے خود بھی ایک نعتیہ دیوان کہا تھا۔وہ یہ بات عمدگی سے جانتے تھے کہ کس زمین میں نعت کہنا آسان اور کس میں مشکل ہے۔امیر کے متعدد بیانات سے پتا چلتا ہے کہ ان کے نزدیک سب سے پہلے یہ انتخاب کرنا ضروری ہے کہ کس زمین میں اشعار کہے جائیں۔امیر کے خیال میں اچھی اور لوچ دار زمین ایسی ہوتی ہے جس سے بامعنی اور پرتاثیر اشعار نکلتے ہیں۔اگر زمین سست ہو تو وقت برباد ہوتا ہے۔بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں کہ:''زمین کے سست ہونے سے اکثر شعر سست ہیں''۔۱۲۳امیر کے بیانات سے زمین کے انتخاب کی بابت تعریف کا ایک اور پہلو بھی سامنے آتا ہے۔وہ یہ کہ جب شاگرد کسی نئی زمین، کسی استاد کی مشہور زمین یا مشکل پامال یا سنگلاخ زمین میں اشعار کہنے میں کامیاب ہو جاتا تو امیر جھوم اٹھتے اور تعریف کرتے نہ تھکتے۔

زاہد حسین زاہد کو ایک خط (گزشتہ صفحات میں مذکور خط نمبر۴) میں رقم طراز ہیں:''پیارے زاہد، زہد مشرب، جام شراب والی غزل اس وقت میں نے دیکھی اور مست ہو کر جھومنے لگا۔مشکل زمین تھی مگر تم نے بہت اچھے اچھے شعر کہے''۔زاہد ہی کے نام ایک اور خط (گزشتہ صفحات میں مذکور خط نمبر۷) میں لکھتے ہیں کہ:''بارک اللہ ایسی پتھر زمین میں کیا نازک شعر کہے ہیں اور کتنے کہے ہیں کہ جی ہی جانتا ہے''۔ایک اور خط میں امیر لکھتے ہیں کہ:''آپ کی قوت فکر اسی سے پیدا ہے کہ ایسی پامال زمین میں سوا سو شعر آپ نے موزوں کیے ہیں۔اللھم زدفرد''۔

امیر شاگردوں کے مزاج اور عادت و اطوار سے واقف تھے۔ان کی حیثیت اس چرواہے کی سی تھی، جو دور کسی درخت کے نیچے بیٹھا جانور پر نظر رکھتا ہے کہ کون سا پرندہ کون سی گھاس کھاتا ہے؟ کون سا جانور کتنی دور جا سکتا ہے؟ کون ایک آواز میں اپنی جگہ واپس آ جائے گا اور کون سا جانور کس قسم کی آواز یا ڈانٹ سے ڈر کر آ جائے گا؟ کس کو پچکارنے کی ضرورت ہے اور کس کو نہیں۔الغرض امیر کا برتاؤ شاگردوں کے مزاج کے مطابق تھا۔

(۱۱)

امیر لکھنوی شاعری کے علم بردار تھے۔لیکن ان کے بعض شاگرد دہلوی طرز کو پسند کرتے تھے۔چناں چہ امیر کسی شاگرد کو پابند نہیں کرتے تھے کہ وہ بھی لکھنوی شعری روایات کا اتباع کریں۔بلکہ امیر کا طریقہ یہ تھا کہ دوران اصلاح دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کے کلام سے اسناد پیش کر کے فیصلہ، عموماً شاگرد ہی پر چھوڑ دیتے تھے۔زاہد حسین کے نام خط میں لکھتے ہیں:''چوں کہ آپ دہلی کی زبان پسند کرتے اور اسی کا اتباع کرتے ہیں، اس لیے آپ لکھیے''۔ایک اور خط سے بھی پتا چلتا ہے کہ امیر یا کسی شاگرد کو مجبور نہیں کیا کرتے تھے۔ایک خط میں مذکور ہے کہ:

''ابر کی بوند بے شک شعراء نے اور شاہ نصیر اور داغ نے کہا ہے۔اس سے یہ غلط نہیں کہا جا سکتا، لیکن اپنی اپنی پسند ہے۔زبانوں پر مستعمل نہ ہونے سے میری طبیعت اس کو پسند نہیں کرتی اور اگر آپ اپنے کلام میں لکھنا چاہتے ہیں تو چنداں مضائقہ بھی نہیں''۔

ایک اور خط میں لکھا کہ:''قرار بہ معنی اقرار عربی و فارسی میں تو نہیں ملتا۔البتہ بغیر واؤ عطف قول و قرار کو جس طرح

آپ نے اردو کرلیا ہے۔اس کا مضائقہ نہیں''۔یا روک ٹوک اس طرح بھی کیا کرتے تھے کہ:''رکھیں میں،اب تخفیفِ کاف کو فصحا خلافِ فصاحت جانتے ہیں''۔

امیر کے مزاج میں یہ لچک اس لیے تھی کہ وہ فطرتاً صلح پسند تھے،عاجزی وانکساری کا نمونہ تھے،انانیت بھی نہیں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے طریقہ تربیت میں خلوص تھا اور ہر اصلاح میں حکمت پوشیدہ ہوتی تھی۔امیر اچھے کلام کے دلدادہ تھے۔کلام شاگرد کا ہو یا کسی معاصر کا تعریف کا حق ضرور ادا کرتے اور تعریف ہی میں کلام کے معائب ومحاسن کی نشان دہی بھی کرتے جاتے۔اسی طرح مشورہ،کوئی شاگرد مانگے یا معاصر،وہ عاجزی وانکساری سے ذمے داری پوری کرتے۔کسی بھی موقعے پر اپنے بڑے پن کی رونمائی نہیں کرتے تھے۔جب کوئی شاگرد یا معاصر اپنے کلام پر رائے طلب کرتا تو غیر جانب داری سے کلام پر رائے دیتے اور کلام،انتخاب کر دیتے۔مثلاً زاہد کے نام خط میں لکھتے ہیں کہ:''چند شعروں پر بے اختیار قلم سے صاد نکل گیا ہے۔آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہی چند شعر انتخاب ہیں۔ان غزلوں میں بہت سے شعر انتخاب ہیں''۔ملاحظہ کیجیے کہ امیر نے کس حکمت سے کچھ اشعار کو صاد کیا اور بقیہ کا اختیار یہ کہہ کر دے دیا کہ''آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہی چند شعر انتخاب ہیں''۔گویا چند اشعار پر بے اختیار صاد نکل گیا وہ تو بہترین ہیں۔لیکن اس کے علاوہ بہتر اشعار بھی ہیں۔جنھیں آپ خود انتخاب کر لیجیے۔

(۱۲)

امیر کی اصلاح کے نظام کا ایک اہم عنصر یہ بھی تھا کہ اچھا شعر جو معمولی اصلاح سے درست ہو سکے اسے رد نہیں کیا کرتے تھے۔مثلاً داغ کو لکھتے ہیں:

> میری عادت ہے کہ کسی کا اچھا شعر جو اندکِ تصرف سے درست ہو سکے، بے دردی سے اس پر چھری نہیں پھیرتا''۔۱۲۴

امیر کے اس بیان کی تصدیق ان کے متعدد مکاتیب سے ہوتی ہے۔مثلاً بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں:''غزل••• سرسری نظر سے دیکھ کر انتخاب کر دی۔تمھارا حسن طبیعت آرائشِ اصلاح کا محتاج نہیں خال خال کہیں کہیں کچھ بنا دینا کافی ہے''۔۱۲۵حبیب الرحمٰن شروانی کو رقم طراز ہیں کہ:''یہ سب شعر اچھے ہیں ایک آدھ جگہ دخل دیا۔باقی ضرورت اصلاح کی نہ تھی''۔۱۲۶ایک اور موقعے پر لکھتے ہیں:''غزلیں دیکھیں،دو تین جگہ تصرف کیا''۔۱۲۷شروانی کو رقم طراز ہیں:''ضروری تصرف کیا،زیادہ حاجت بھی نہیں''۔۱۲۸زاہد کو(مذکور خط نمبر ۷) لکھتے ہیں:''غزلیں دیکھیں بقدر ضرورت بنائیں''۔بعض اوقات شاگرد کا اصرار ہوتا تھا کہ استاد لازماً اصلاح کریں تو ایسی صورتِ حال میں،امیر شاگرد کے اطمینان کے لیے کہیں کہیں اصلاح کر دیتے تھے ایک موقع پر لکھتے ہیں کہ:''اپنا حق ثابت کرنے کو میں نے کبھی کچھ دخل دیا''امیر کے کئی خطوط سے پتا چلتا ہے کہ شعر،انتخاب کرنے کے بعد جو اشعار رکھنے کے نہیں ہوتے اس کی وضاحت بھی بہت واضح انداز میں کیا کرتے تھے۔مثلاً بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں کہ:

> ''غزل آپ کی میں نے دیکھ لی۔۲۲ شعروں پر انتخابی صاد کر دیا ہے۔یہی چھپنے کو دیے جائیں۔تو بہتر ہے اور شعر بھی صحیح ہیں مگر وہ اس مرتبے کے نہیں ہیں''۔۱۲۹

بشیر ملیح آبادی کے نام خط میں مذکور ہے کہ:

''پوری غزل اچھی ہے۔ جو شعر قابل انتخاب نظر آئے ان پر صاد کر دیا ہے۔ ان کے علاوہ جو اشعار دائرہ تغزل سے باہر نہیں ان پر ''بت'' بنا دی ہے۔ یہ اشعار بھی سب غزل میں رکھنے کے قابل ہیں باقی اشعار کے رکھنے میں اختیار ہے''۔[۱۳۰]

امیر شاگردوں کا کلام نہایت توجہ سے دیکھتے۔ بناتے۔ انتخاب کرتے، وجوہ لکھتے اور پھر شاگرد کے حوالے کر دیتے اور یہ اختیار بھی اسے دیتے تھے کہ اصلاح قبول کرے یا نہ کرے۔ اصلاح کے بعد بھی شاگرد کسی مسئلے میں وضاحت چاہتا تو تسلی بخش جواب تحریر کرتے۔ مستند کتب ورسائل کے حوالے دیتے اور یہ بھی وضاحت کرتے کہ کون سی کتابیں شاگردوں کے لیے مفید ہیں اور کون سے مضر ہیں:

''مخزن المحاورات چرنجی لال کا کیا اعتبار اس میں ہزاروں محاورے گنواروں کے لکھے ہیں''۔[۱۳۱]

اسی خط میں رقم طراز ہیں کہ:

''باٹ دیکھنا، راہ دیکھنے کے معنی [میں] فصحائے لکھنؤ و دہلی کی زبان نہیں۔ میر کا کہنا اس وقت سند نہیں ہو سکتا، اس وقت بولتے ہوں گے۔ اب کوئی نہیں بولتا''۔[۱۳۲]

مذکورہ معلومات کے تسلسل میں احسن اللہ ثاقب کے نام ایک خط کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے امیر کی تربیت کے ایک اور پہلو کا پتا چلتا ہے:

''جو، قسم شعر کہیے ابتداء میں کسی استاد سے اصلاح لیجیے۔ اس کی محو اثبات سے چند روز میں خود راہ راست پر آ جایئے گا۔ لغزش جاتی رہے گی۔ رہا منزل مقصود پر پہنچ جاتا، یہ بہت مشکل ہے۔ اسباب سب فراہم ہوں، تب بھی:

عمرے باید کہ یار آید بہ کنار

عروضِ عربی کے رسائل بہت ہیں۔ بعضے چھپ بھی گئے ہیں۔ 'معیار الاشعار' محقق نصیر الدین طوسی، جامع عروض عربی وعروضِ پارسی ہے اور اگر عروضِ عربی زبان، عربی میں مقصود ہو تو شرح قصیدہ خزجیہ دیکھیے اور مولوی محمد سعد اللہ صاحب مرحوم نے عروض یا قافیہ ایک متن مع شرح لکھا ہے۔ وہ چھپ گیا ہے۔ وہاں نہ ملے تو میں تلاش کر کے بھیج دوں گا''۔[۱۳۳]

امیر کو عربی وفارسی لغات اور عروض سے متعلق رسائل کا گہرا ادراک تھا۔ فارسی اور اردو کی شعری روایات پر بھی گہری نگاہ تھی۔ ان کے عہد تک جو لغات اور عروض، تذکیر وتانیث ومحاورات سے متعلق کتابیں تالیف ہوئی تھیں۔ وہ امیر کی دسترس میں تھیں۔ اور جو باتیں کتابوں میں نہیں ملتی وہ ان کے سینے میں محفوظ تھیں۔ گویا امیر علم کا ایک دفتر تھے۔ یہاں آنے کے بعد شاگرد کندن ہو کر نکلتا۔ جو شاگرد آ نہیں سکتے وہ خط وکتابت کرتے اور فیض یاب ہوتے۔ شاگرد، امیر سے جو پوچھتے ا س کا وہ اطمینان بخش جواب دیتے۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں پر بھی حاشیے لکھتے اور سند میں اساتذہ کے اشعار پیش کرتے۔ جہاں بحث مطلوب ہوتی تو تفصیل سے ہر ہر پہلو پر نظر کرتے۔ اس کی مثال میں زاہد حسین زاہد کے نام وہ خطوط پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جو گزشتہ صفحات میں مندرج ہیں۔ اس کے علاوہ ''مشاطہ سخن'' حصہ اوّل اور دوم میں بھی امیر کی جو اصلاحیں یکجا کی گئیں وہ بھی قابل توجہ ہیں۔

اب ذیل میں اصلاح کے لیے آنے والے کلام پر امیر کی شاعری پر لکھے گئے کچھ حاشیے پیش کیے جاتے ہیں، جو امیر کے استادانہ مرتبے کو اُجاگر کرتے ہیں اور اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ امیر، تلامذہ کے کلام کو کس زاویے سے جانچتے تھے۔

۱۔ مصرع ثانی جو (نباؤ گے) کی تکرارِ مقیدِ تاکید ہے اس کے مقابل مصرع اولیٰ میں (نہیں آتا) کی تکرار زیادہ مناسب وموزوں ہے۔

۲۔ چھیلا کا قافیہ ضرور کہنے کا ہے۔ شوخ لفظ ہے، ضرور لکھیے۔

۳۔ تناسب الفاظ کے علاوہ قدم قدم دوسرے کے دوش پر ہاتھ رکھ کر اٹھنا غایتِ ضعف کو ظاہر کرتا ہے۔

۴۔ نقش پائے صنم کو مٹانے کی علت پوشیدہ تھی۔ شوقِ سجدہ نے ظاہر کر دیا اور احترامِ نقشِ پا اور پرستشِ بے خودی شوق سے ثابت ہوگئی۔

۵۔ دوسرے مصرعے میں (ہاتھ سے) کی جگہ مے خواروں بنا دیا ہے۔ کیوں کہ اسی قدر مے نوشی میں ہے کہ جب جام شراب کو یہ فخر حاصل ہو کہ اس کے ہاتھ تک پہنچا ہے۔ تو ایسے جامِ شراب کا ہوش مے خواروں کو کیوں نہ ہو اور جب (اس ہاتھ) کہیے گا تو جامِ شراب کے اس ہاتھ تک پہنچنے کا کیا فائدہ رہے گا۔

۶۔ جرس کا کھڑکنا فصحا نہیں کہتے، اس لیے بدلا گیا۔

۷۔ مصرع اول میں ''پیالے'' کی چنداں ضرورت نہ تھی معہذا بندش بھی ذرا چست ہوگئی۔

۸۔ مئے صاف میں دُرد کہاں اور زنگ کو آئینے سے علاقہ ہے نہ کہ شیشے سے۔

۹۔ جام تو دوسروں کو مست کرنے والا ہے۔ خود مست و مدہوش نہیں۔

۱۰۔ عیاں ہو، سے بھڑکتی آگ میں، زیادہ گرمی وزور ہے۔

۱۱۔ کر دے گی، کی ''ے'' اوّل کا گرنا ناپسند کر کے اس کی جگہ (کر گئی بنانا) ٹھیک ہے۔

۱۲۔ الفاظ ہندیہ میں سے آخر کا حرف گرتا ہے بیچ کا نہیں گرتا۔ فلہٰذا وہاں کی تصحیح کر دی گئی۔

۱۳۔ نشے میں ''ی'' سے پہلے ہمزہ مقرر چاہیے۔

۱۴۔ اضافت کی حالت میں اعلان نون جائز نہیں۔

۱۵۔ ویا اب بالکل متروک ہے۔ اس جگہ صرف یا بولتے ہیں یا کاف سے کام لیجیے جو ''یا'' کے معنی میں آتا ہے۔

۱۶۔ یہ دونوں مصرعے اچھے ہیں۔ مگر تناسب الفاظ کے لحاظ سے مصرع اوّل، اوّل ہے۔

یہ تمام حاشیے شاگردوں کے نام خطوط سے اقتباس کیے گئے ہیں۔ ان میں سے بہت سے نکات وہ ہیں جو امیر کے دور میں ہونے والے شعروادب سے متعلق مباحث سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جو اس دور میں شائع ہونے والی کتابوں کے حوالے سے ہیں۔ گویا امیر کے خطوط میں اٹھارویں صدی کے آخری ربع میں ہونے والی علمی، ادبی اور لسانی مباحث کی بازگشت بھی ملتی ہے۔ اس موقعے پر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ امیر کے دور میں ہونے والی شعروسخن سے متعلق بحث ومباحثے میں امیر اور ان کے تلامذہ کا کردار کیسا رہا۔ اس سلسلے میں بھی شاگردوں کے نام ان کے خطوط ہماری بے حد معاونت کرتے ہیں۔ امیر

نے تلامذہ کی تربیت میں اس بات کا خیال رکھا تھا کہ وہ اختلافی باتوں سے گریز کریں، اس حوالے سے امیر کے کچھ اصول زاہد کے نام خط میں ملتے ہیں:

"تمام عمر تجربہ ہوا کہ اوّل تو مناظرہ جو احقاقِ حق سے عبارت ہے ہوتا ہی نہیں اور بالفرض ابتداء میں کہیں ہوتا بھی ہے، تو انجام کار مکابرے اور مجادلے کی طرف کھینچا جاتا ہے۔ لہٰذا میں کبھی ان جھگڑوں میں نہیں پڑتا اور کسی استفتے پر فتویٰ نہیں دیتا۔ البتہ میرے سچے دوست جو بات مجھ سے پوچھتے ہیں اپنی رائے ناقص کے موافق ان کو بتا دیتا ہوں"۔

امیر ہمیشہ جھگڑے فساد سے بچتے تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ اس کے نتائج کچھ اچھے نہیں ہوں گے، اس لیے وہ شاگردوں کو بھی لڑنے جھگڑنے پر روک ٹوک کرتے اور نصیحتیں بھی۔ زاہد کے نام خط میں لکھتے ہیں: "آپ کو بھی نصیحت کرتا ہوں کہ بے فائدہ دردِ سر مول نہ لیا کیجیے"۔ ایک اور خط میں زاہد کو رقم طراز ہیں کہ: جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ سچ اور صحیح ہے تو منفعل ہونا چاہیے اور آئندہ احتیاط کرنا چاہیے اور اگر تعصب سے غلط بات لکھی ہے تو صبر کرنا چاہیے"۔۱۳۴؎ عابد علی کوثر خیرآبادی کو لکھتے ہیں: "آپ کسی سے تو لڑیے نہیں••• سمجھا دیجیے••• میرا تو یہ خیال ہے پھر وہ تاویلات کرے تو چپ ہو رہیے"۔۱۳۵؎ امیر کی یہ حکمت عملی غیروں اور اپنوں کے ساتھ یکساں تھی۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں کہ:

"اگر کبھی کوئی شاگرد بھی، آپ کے شعر میں شبہ کر کے کچھ عرض کرتا تو محض بہ نظر احتیاط ردو بدل فرما دیتے"۔۱۳۶؎

ایک اور موقعے پر ممتاز علی آہ رقم طراز ہیں:

"جس دن فن شعر میں کچھ بحث آ پڑتی تو پھر استاد اور شاگرد دونوں کی آستینیں مباحثے پر چڑھ جاتیں۔ گھنٹوں بحث رہتی"۔۱۳۷؎

امیر کا اصول یہ تھا کہ جو اعتراض کیا جائے اس سے متعلق دلیل ضرور پیش کی جانا چاہیے۔ چناں چہ شاگرد جب امیر کے کلام پر صائب دلیل کے ساتھ اعتراض کرتے، تو وہ اسے قبول کر لیا کرتے تھے اور کبھی شاگرد کے کلام میں کوئی ایسی بات ہوتی جو امیر کی سمجھ سے بالاتر ہوتی تو اعتراف کر لیا کرتے تھے۔ زاہد نے اپنے کسی شعر "بلعم" کا لفظ استعمال کیا تھا امیر اس کی بابت لکھتے ہیں کہ: تمھارے ایک شعر کے معنی میں نہیں سمجھا کہ 'بلعم' کی طرح دوش وسر کیا چیز ہے"۔۱۳۸؎ زاہد نے "بلعم" کی وضاحت لکھی: جس کے جواب میں امیر رقم طراز ہیں کہ: بلعم بار کا حال جو تم نے لکھا، میں نے دیکھا۔ اب وہ شعر بے تکلف رکھنے کے قابل ہے۔۱۳۹؎ زاہد نے خط میں کسی موقعے پر "دنبل" لفظ لکھا تھا۔ امیر نے اس لفظ پر اعتراض کیا اور لکھا کہ "دمل لفظ عربی ہے۔ دمامیل اس کی جمع ہے۔ 'دنبل' صحیح نہیں"۔۱۴۰؎ زاہد نے اس اعتراض کو قبول نہیں کیا اور جواب میں اس کی مزید وضاحت چاہی۔ امیر نے انھیں لکھا کہ: "دنبل کی صحت میں اس لیے کلام ہے کہ کہیں فارسی میں پایا نہیں جاتا"۔۱۴۱؎ زاہد نے پھر اس اعتراض کو قبول نہیں کیا اور امیر کو سند لکھ بھیجی۔ چناں چہ امیر نے اسے قبول کیا اور جواب لکھا: "دنبل کا فارسی میں صحیح ہونا آپ کی اس تحریر سے معلوم ہوا۔ آپ نے جن لغات کا یعنی ہفت قلزم، وتتمۂ برہانِ قاطع کا حوالہ دیا ہے۔ میں بھی اس میں انشاءاللہ دیکھوں گا"۔۱۴۲؎

امیر کے مزاج میں تحقیق و جستجو کا مادہ بہت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قدم قدم پر احتیاط ملتی ہے۔ اس کی ایک

وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ علم لسان سے انھیں خصوصی شغف تھا اور وہ لغت نویسی کا بھی شوق رکھتے تھے۔ اسی لیے لفظوں کے استعمال میں احتیاط ان کے مزاج کا حصہ ہوگئی تھی۔ یہی صفت وہ اپنے شاگردوں میں بھی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جس میں وہ کام یاب ہوئے۔ احسن اللہ ثاقب کو لکھتے ہیں کہ:

''احتیاط اچھی ہوتی ہے۔ شبہے کی بات سے جہاں تک ممکن ہو۔ بچنا ہی چاہیے''۔ ۱۴۳؎

امیر کی بار ہا توجہ سے احتیاط، تلامذہ کے مزاج کا حصہ بن گئی تھی۔ چناں چہ بعض وقت شاگرد امیر کے جوابات سے متفق نہیں ہوتے تو وہ مزید وضاحت کے طلب گار ہوتے اور امیر نہایت توجہ سے ان شبہات یا اعتراضات کے جواب ارسال کرتے۔ کوثر خیر آبادی کے نام مکتوب میں لکھتے ہیں:

''جو شبہات آپ نے لکھے ہیں۔ ان میں سے بعض تو میں رفع کیے دیتا ہوں اور بعض اس پر موقوف ہیں کہ پورا شعر اپنا اور اصلاح میری لکھیے۔ واضح ہو گیا کہ 'کھائے پھرتے ادھار ہم بھی ہیں، محاورہ فصحا کا نہیں ہے اور بندش بھی تعقید سے خالی نہیں۔ کھائے پھرتے ادہر ادر ہیں ادہر اور بیچ میں ادہار ہم بھی، خوش نما نہیں۔ چاہو رہنے دو۔

سیہ بختی میں عدیم المثل، سیہ بختی میں یائے تحتانی کا اسقاط نہ چاہیے۔ ترکیب فارسی ہے اگرچہ بعض اساتذہ اردو کے کلام میں سند ملتی ہے۔ مگر کیا ضرور ہے''۔ ۱۴۴؎

امیر کے اصلاح کی یہ خوبی ہوتی تھی کہ شاگرد صاحبِ نظر ہونے کے ساتھ ساتھ پُر اعتماد بھی ہو جاتا اور اس میں تلاش و جستجو کی صلاحیت پیدا ہو جاتی کہ اس حد تک کہ وہ استاد سے بھی بحث و مباحثے سے گریز نہیں کرتا۔ یہ امیر کا کمال تھا کہ وہ علمی تفہیم کے لیے ہر شاگرد کو باکمال بنانے میں اپنی تمام تر صلاحیتوں کو استعمال کرتے تھے۔ خود بھی عاجزی انکساری کا دامن نہیں چھوڑتے اور اپنے رویے سے شاگرد کو بھی انکساری پر مجبور کر دیتے۔ اصل میں امیر انسانی نفسیات سے آگاہ تھے۔ وہ شاگردوں سے لاڈ پیار کرتے۔ لیکن علمی معاملات میں وہ اکثر مواقع پر روایتی استاد تھے۔ شبہے کو دلیل ہی سے قبول کرتے۔ جلیل، ''سوانح امیر'' میں لکھتے ہیں کہ:

''شاگردوں کی اصلاح و تعلیم کی جانب خاص توجہ تھی اور وہی توجہ اس کا باعث ہوئی کہ کثرت سے لوگ فیض یاب ہوئے''۔ ۱۴۵؎

امیر تلامذہ کے کلام پر اصلاح دیتے وقت کچھ باتوں کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ مثلاً:

۱۔ جو زمین شعر میں استعمال ہوتی ہے، اسے اساتذہ نے بھی استعمال کیا ہے یا نہیں؟ اگر استعمال کیا تھا، تو کیا اچھے شعر نکلے تھے؟ اور کیا اس میں اچھے شعر کی گنجائش ابھی ہے یا نہیں؟ اگر اس زمین، جس میں اب اچھے شعر نہیں نکل سکتے، تو اسے ترک کر دینا چاہیے۔ لیکن اگر کوئی شاگرد اپنی ذہانت سے اچھے شعر نکالنے میں کام یاب ہو جاتا تو امیر اس کی بے حد تعریف کرتے۔ جس طرح زاہد کی تعریف کی ''جس زمین میں انشا نے چار شعر نکالے آپ نے اس میں دریا بہا دیے۔ بارک اللہ فی عمرکم''۔ ۱۴۶؎ انشا کی غزل کا موازنہ کرتے ہوئے امیر نے ایک مرتبہ زاہد کو پھر لکھا کہ:

''انشا کی غزل کے سوا لیلا، میلا کے قافیوں میں، میں نے کوئی غزل اب سے پہلے نہیں دیکھی۔ کیا

عمدہ غزل آپ نے کہی ہے۔ آپ کی طبیعت کا حسن ہر شعر سے ظاہر ہے''۔ ۱۴۷؎

۲۔ امیر اپنے تلامذہ کو فصحا کی روایات پر عمل کرنے پر زور دیا کرتے تھے۔ اگر کسی موقعے پر شاگرد اس کے برخلاف جاتا تو ٹوک دیا کرتے۔ ایک خط میں ہے کہ: ''جرس کا کھڑکنا فصحا نہیں کہتے''۔ ۱۴۸؎ ایک اور موقعے پر ہے کہ: ''گھڑنا اور گھڑھنا دونوں صحیح ہیں، مگر گڑھنا شعراء کے کلام میں نہیں پایا''۔ ۱۴۹؎ ''مہیں'' کے لیے لکھتے ہیں: ''میں ہی کی جگہ بول چال میں چاہے آجاتا ہو مگر کسی معتبر کلام میں اب تک نظر سے نہیں گزرا، حکم اس کو استعمال کا نہیں دیا جا سکتا''۔ ۱۵۰؎

۳۔ کوئی ایسا لفظ جسے قدما نے تو استعمال کیا تھا، لیکن متوسطین یا متاخرین نے ترک کر دیا، تو اس لفظ کو بدلنے کا مشورہ دیتے۔ جیسے احمد حسین مذاق کو رقم طراز ہیں:

''حالتِ اضافت میں اعلان نون مضاف الیہ میری رائے میں جائز نہیں ... اردو زبان میں قدما تو کہتے ہیں، مگر طبقہ متوسطین و متاخرین کے محققین نے ترک کر دیا''۔ ۱۵۱؎

۴۔ امیر شاگردوں کے کلام میں محاورے کے استعمال پر بھی خصوصی نگاہ رکھتے تھے۔ اس سے غرض نہیں تھی کہ محاورہ لکھنؤ کا ہے یا دہلی کا۔ البتہ یہ ضرور دیکھتے تھے کہ دہلی یا لکھنؤ کے فصحا محاورہ گفتگو میں تو استعمال کرتے ہیں لیکن کیا کبھی کلام میں بھی استعمال کیا ہے۔ امیر اس وقت تک اسے محاورے کے استعمال کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ جب تک کسی استاد کے کلام سے سند نہ مل جائے۔ مثلاً نواب عالم گیر کو لکھتے ہیں:

''پتھر اپنی جگہ پر بھاری ہے۔ کلام میں میری نظر سے نہیں گزرا، مگر اکثر فصحائے دہلی کو میں نے بولتے ہوئے سنا ہے۔ خیال رکھوں گا، اگر کہیں کلام میں پاؤں گا تو سند بھیجوں گا''۔ ۱۵۲؎

ایک اور موقعے پر محاورہ ''جامہ سے باہر ہونا'' کی بابت لکھتے ہیں:

''جامہ سے باہر ہونا اور اس کی امثال میں بے خودی ضروری ہے۔ مگر بے خودی کی علل بہ اختلافِ مواقع مختلف ہوتی ہے۔ کہیں غضب، کہیں کمال سرور، کہیں کمال رشک و قس علیٰ ھذا۔ ناسخ کے اس شعر میں:

تجھ کو جس گل پیراہن نے اک نظر دیکھا وہی
نکہتِ گل کی طرح جامے سے باہر ہو گیا

منشائے بے خودی رشک ہے اور اس شعر ناسخ میں:

اپنے جامے سے وہیں ہو گئے باہر لاکھوں
گھر سے پوشاک بدل کر جو وہ باہر آیا

منشائے بے خودی وفورِ سرور ہے اور اس فقرے میں کہ تم سے کوئی کیا دردِ دل کہے۔ تم تو ذرا ذرا سی بات میں جامے سے باہر ہو جاتے ہو۔ منشائے بے خودی فرطِ غضب ہے۔ بہر حال آپ کے اس شعر میں:

جامے سے باہر ہے جب سے چھولیا تیرا لباس
عطر کی بو ہر طرف پھرتی ہے اترائی ہوئی

''منتہائے بے خودی وفور سرور ہے۔۔۔ چوں کہ مقصود آپ کے شعر کا صحیح اور اس میں محاورے کا برمحل ہونا ظاہر کرتا تھا۔ لہذا جلدی میں، میں نے اسی قدر اس وقت لکھا تھا فصحا نے اس محاورے کو کمال خوش ہونے کی جگہ استعمال کیا ہے اور یہ توضیح نہیں کی تھی کہ منشائے بے خودی ہر جگہ مختلف ہوا کرتا ہے''۔۱۵۳

امیر نے اپنے مذکورہ خط میں محاورے کے استعمال اور اس کے مفہوم کی بابت تفصیل سے اظہار کیا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی وضاحت کی ہے کہ فصحا کے نزدیک اس کا استعمال کس کس نوعیت کا تھا۔

۵۔ امیر اپنے تلامذہ کو درست زبان کے استعمال اور متروکات سے بچنے کی بار بار تنبیہ کیا کرتے تھے۔ ان کے نزدیک شعر کا حسن درست زبان اور غیر متروک الفاظ کے استعمال ہی سے سامنے آتا ہے اور فصاحت کا لطف بھی۔ مثلاً: ایک شاگرد کو لکھتے ہیں: ''تیروں کا گنجان ہو کر بیٹھنا یہ زبان نہیں ہے''۔۱۵۴ ایک اور اصلاح میں لکھتے ہیں: ''پہ بہ معنی لیکن وگر واجب الترک ہے''۔۱۵۵ ایک شاگرد کو رقم طراز ہیں: ''مینہ کی بوند و مینہ کے پانی کی بوند یہ سب درست ہے۔ مگر ابر کی بوند مستعمل نہیں''۔۱۵۶ امیر ایک اور اصلاح میں لکھتے ہیں: ''پرے لکھنؤ میں بالکل متروک ہے اور دہلی میں بھی، اب فصحا کے کلام میں پایا نہیں جاتا''۔۱۵۷

امیر کی اصلاح کے حوالے سے سردست پانچ نکات پیش کیے گئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسی نوعیت کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً: یہی کہ مفہوم کے اعتبار سے کلام پر کشش ہے یا نہیں۔ فنی اعتبار سے کلام میں کیا کیا خوبیاں اور خامیاں ہیں، لفظوں کی نشست و برخاست میں درستی ہے یا نہیں، شعر کی روانی میں کیا بات مانع ہے، خیال میں بلندی کا معیار کیسا ہے؟ تذکیر و تانیث کے برتنے میں احتیاط ہے یا نہیں۔ تشبیہات و استعارات کا معیار کیسا ہے؟ معیار سخن کا خیال رکھا ہے یا نہیں؟ گویا اس جائزے سے امیر کی اردو زبان و ادب سے دل چسپی، اردو و فارسی شاعری کی روایت پر ان کی گہری نظر اور اساتذہ اردو کی تصریحات پر روشنی پڑتی ہے۔

اس جائزے سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امیر اردو زبان اور اردو شاعری کے بارے میں شاگردوں کو کس حد تک معلومات بہم پہنچانے کی تگ و دو کیا کرتے تھے۔ وہ شاگردوں سے خود بھی رابطے میں رہتے اور انھیں جلد رابطہ کرنے کی تنبیہ بھی کیا کرتے تھے۔ تاکہ اسباق بڑھتے رہیں۔

الغرض امیر کے خطوط میں شعر و سخن کی اصلاح کے حوالے سے ایک نظام ملتا ہے۔ ہمارے علم کے مطابق اردو شاعری کی تاریخ میں امیر کے علاوہ کوئی دوسرا شاعر نہیں گزرا، جس نے اپنے شاگردوں کی تربیت کا کوئی نظام وضع کیا ہو۔ بلاشبہ امیر ایک اعلیٰ پائے کے شاعر ہی نہیں، زبان داں بھی تھے اور ایک وسیع النظر استاد بھی۔ ان کی خاص تربیت ہی تھی، جس کی وجہ سے تلامذہ امیر نے اردو شاعری میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔

امیر ایک وضع دار استاد تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے منصب کا غلط استعمال نہیں کیا۔ حالاں کہ جو استاد شاگردوں کی

ایک بڑی فوج رکھتا ہو۔ خود بھی عالم ہو اور شاگرد بھی صاحبِ علم ہوں۔ وہ کسی معاصر کو کب سکون سے رہنے دیتا۔ امیر چاہتے تو ''امیر اللغات'' کی مخالفت میں اٹھنے والے اہلِ دہلی کے خلاف ایک محاذ کھول دیتے۔ لیکن انھوں نے اس کام کی نیت کا ارادہ بھی نہیں کیا۔ اردو کی ادبی تاریخیں ہی نہیں ان کے خطوط بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ امیر نے کبھی تلامذہ کو معرکہ آرائی کے لیے نہیں اکسایا۔ بلکہ دور رکھا۔ اس لیے کہ امیر جانتے تھے کہ یہ کام ان کا نہیں ہے ان کے پیشِ نظر تو نہایت اعلیٰ مقاصد تھے اسی لیے انھوں نے تمام تر برے حالات کے باوجود اپنے تلامذہ کو علم سے سرفراز کیا۔ اس کا کیا فائدہ ہوا۔ یہ ڈاکٹر کریم الدین احمد بتاتے ہیں:

> ''داغ کے شاگردوں کی طرح، امیر کے شاگردوں نے مختلف راستے اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی۔ امیر کی شاعری اور شخصیت نے ہر موڑ پر ان کی راہ نمائی کی اور وہ قریب قریب اسی راستے پر گامزن رہے۔ جس پر امیر انھیں چلانا چاہتے تھے۔ کسی شاعر کے لیے اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے شاگرد اس کا مسلکِ شاعری زندہ رکھیں''۔ ۱۵۸؎

امیر نے اپنے تلامذہ کی شعر و سخن کے حوالے سے بھی تربیت کی اور دنیاوی معاملات میں بھی ان کی راہ نمائی کی۔ گویا امیر نے اپنے شاگردوں کو تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ تہذیب یافتہ بھی کیا۔ جس کے لیے انھوں نے نت نئے طریقے اختیار کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بہت سے شاگرد صرف امیر کی شخصیت سے متاثر ہو کر ان کے قریب آئے۔

گزشتہ صفحات میں امیر کے مکتوبات کی مدد سے، بہ حیثیت استاد، امیر کی شہرت کے اسباب اور ان کے اس نظامِ تربیت کے متعلق معلومات فراہم کی گئیں، جس کی بدولت وہ اپنے عہد کے ممتاز شاعر اور استاد قرار پائے۔ اب امیر کے مکتوبات میں تلامذہ سے متعلق ان امور کا حاطہ کیا جاتا ہے۔ جس کی بدولت امیر کی شخصیت شاگردوں کے لیے پرکشش اور قابلِ تقلید قرار پائی۔

(۱۰)

امیر اپنے شاگردوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ خطوط لکھ کر ان کی خیریت دریافت کرتے، ان کے بچوں کے بارے میں فکر مند رہتے، انھیں دعائیں دیتے۔ خط لکھتے تو نہایت خلوص و محبت اور انکساری سے مخاطب کرتے۔ مثلاً ''پیارے برہم''، ''داغِ دل کے مرہم'' پیارے برہم، نورِ چشم ممتاز'' پیارے کوثر، ارحم الراحمین بہ طفیلِ ساقی کوثر تم کو دونوں جہاں میں جام مراد سے سیراب کرے''، پیارے کوثر اللہ تعالیٰ آپ کی عمر و اقبال میں برکت دے اور دولت کونین سے مالا مال کرے''۔ وغیرہ۔

امیر فطرتاً محبت کرنے والے انسان تھے۔ وہ شاگردوں کی دل جوئی کرتے اور ہر ممکن کوشش کرتے کہ ان کی ذات سے انھیں کوئی تکلیف نہ ہو اور جس حد تک فائدہ پہنچا سکتے، اس کی تگ و دو کرتے۔ شاگرد بیمار ہوتا تو نسخے لکھوا کر بھیجتے اور اس پر عمل کرنے کی سخت تاکید کرتے:

> ''میں نے لطیف احمد سلمہ کے خط میں سری لال پیارے لال کے یہاں سے عرق منگوا کر استعمال کرنے کو لکھوا دیا تھا۔ آپ ضرور استعمال کریں۔ ضلع ایٹہ میں ان کے یہاں اس عرق کی شیشیاں بکتی ہیں۰۰۰ چار مہینے کے بچے سے لے کر بڈھوں تک میں نے استعمال کرایا ہے۔ بار بار تپ کا آ جانا اچھا نہیں۔ اس کے ازالہ کی فکر ضروری ہے اور یہ عرق میرے تجربے میں ہے کہ اکسیر کا حکم رکھتا ہے''۔ ۱۵۹؎

امیر کے چہیتے شاگرد، زاہد حسین بیمار ہوگئے تھے۔ جس کے باعث وہ امیر کو خط نہ لکھ سکے اور نہ امیر کے خطوط کا جواب دیا۔ زاہد نے صحت مند ہونے کے بعد امیر کو اپنی خیریت سے مطلع کیا تو امیر نے جواباً لکھا کہ:

''شافیِ مطلق تم کو شفائے کامل عطا فرمائے اور اصلی طاقت وتوانائی جلد عود کر آئے۔ اتنے دنوں تک تمھارا خط نہ آنے سے جو دھڑکا بار بار دل میں سماتا تھا، آخر تمھارے خط سے تفصیل کے ساتھ اس کی اصلیت معلوم ہوئی اور بیمار اور زار نزار دل کو بہت ہی افسوس ہوا، میں کہتا ہی تھا کہ زاہد سا محب ویرینہ میرے خطوط کا جواب نہ لکھے اس کے کیا معنی۔ ہونہو کوئی مانع قوی ضرور ہے۔۔۔ افسوس تم نے بہت تکلیف اٹھائی مجھ بوڑھے سے اور کیا ہوسکتا ہے۔ سوا اس کے تمھاری صحت اور تندرستی کے لیے یہیں سے دعا کروں''۔[۱۶۰]

حکیم برہم کی بہن کے گھر اور حکیم برہم کی کچہری میں چوری ہو جانے کی اطلاع امیر کو ملتی ہے۔ چناں چہ امیر برہم کے نام ایک مکتوب میں اس طرح افسوس کرتے ہیں:

''پیارے برہم۔۔۔ آپ کی بہن کے یہاں چوری ہو جانا اور آپ کی کچہری سے سامان مہمانیِ احباب اٹھ جانا، باعث افسردگی دل ہوا۔ خداوند تعالیٰ حسنِ نیت کے اثر سے نعم البدل عطا فرمائے''۔[۱۶۱]

امیر شاگردوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے بے چین رہتے۔ جب شاگردوں کے خطوط سے خیریت معلوم ہوتی، تو بے حد خوش ہوتے اور دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے۔ ۲۹ر نومبر ۱۸۸۱ء کے خط میں ثاقب کو لکھتے ہیں کہ: ''میں آپ کی کس کس عنایت کا شکر کروں کہ مجھ سے ناچیز کو بایں خوبی واخلاق یاد فرماتے ہیں''۔[۱۶۲] زاہد کو ۱۳ر اپریل ۱۸۹۱ء کے خط میں مختصر خط لکھنے کی شکایت کرتے ہیں: ''آپ نے مراسلت کیوں ترک کی۔ بحمد اللہ آج آپ کی تحریر پر تنویر دیکھنے میں آئی چوں کہ اختصار کی وجہ سے تسکین خاطر پورے طور سے نہیں ہوتی لہٰذا مفصل تحریر کا خواستگار ہوں''۔[۱۶۳] برہم کو ۱۵ر جون ۱۸۹۲ء کے مکتوب میں رقم طراز ہیں: ''میاں برہم اب خط لکھا ہے تو لکھتے رہو۔ پھر ایسا غوطہ نہ لگانا کہ مہینوں خبر نہ لو، ماشاء اللہ جوان ہو، میری کوتاہ قلمی کو معاف کر دیا کرو''۔[۱۶۴] ۲۲ر نومبر ۹۵ء کے خط میں پھر برہم کو لکھتے ہیں۔ اس مرتبہ کچھ سرزنش کی کیفیت ملتی ہے:

''تمھارے نزدیک یہ ضروری کام میں داخل نہیں کہ داعی خیر کو دو کلمہ خیریت سے کبھی کبھی مطمئن کرو۔ خیر! ہم کو یاد کرو یا نہ کرو ہم تو دعا دیتے ہیں۔ شعر

گو نہیں پوچھتے ہرگز وہ مزاج
ہم تو کہتے ہیں دعا کرتے ہیں''۔[۱۶۵]

عرصہ دراز کے بعد مولوی محمد اعجاز حسن خاں کا خط آیا، جسے پڑھ کر امیر جذباتی ہوگئے جواب میں انھیں رقم طراز ہیں:

''مدت کے بعد تمھارا نمیقۂ سعادت سرور نمود افزائے دل دودیدہ ہوا۔

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است

اگر اپنا بوڑھا، دعا گو سمجھ کر کبھی کبھی پوچھتے رہو تو تمھاری محبت وسعادت ہے۔ ورنہ کیا شکایت ہے۔۔۔

صرف تم لوگوں کے تصور سے اپنے دل کو خوش کر لیا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ زندہ اور خوش رکھے۔ باقی دعا کے سوا کیا لکھوں''۔ ۱۶۶؎

امیر کے بہ کثرت شاگرد تھے۔ جن کے خطوط پر خطوط آیا کرتے تھے۔ امیر ممکن حد تک جوابات ارسال کرتے، اس کے باوجود بہت سے خطوط کے جوابات لکھنے سے رہ جاتے تھے۔ لیکن امیر، شاگردوں سے توقع رکھتے تھے کہ وہ ان کی کوتاہ قلمی معاف کرتے ہوئے اپنی خیریت سے ضرور مطلع کرتے رہیں۔ اس لیے کہ امیر کی شدید خواہش ہوتی تھی کہ وہ تمام شاگردوں سے باخبر رہیں۔ دل شاہجہاں پوری کو لکھتے ہیں:

''آپ اپنی خیریت سے کبھی کبھی مسرور کرتے رہیں۔ ادھر سے جواب میں تاخیر ہو تو مجھے رنجور و معذور سمجھ کر بے التفاتی سے محمول نہ کریں''۔ ۱۶۷؎

منشی امتیاز احمد خاں راز کے خط آنے پر امیر کی کیفیت ملاحظہ کیجیے:

''نامۂ سعادت'' شامہ آیا، میں نے تمھاری جگہ اس کو پیار کیا۔ آنکھوں سے لگایا، خداوند تعالیٰ تمھارے عمر و اقبال میں برکت دے اور صحت و عافیت دارین نصیب کرے''۔ ۱۶۸؎

خط کے نہ آنے پر حکیم کوثر خیر آبادی سے دوستانہ انداز میں شکوہ کرتے ہیں:

''حکیم صاحب دل کے بڑھانے والے، اگلی صحبتوں کے یاد دلانے والے خطوط، آپ کے کم آتے ہیں اور جی چاہتا ہے کہ زیادہ آئیں۔ بشرطیکہ غزلیں ان میں نہ ہوں''۔ ۱۶۹؎

شاگردوں کے خطوط امیر کے لیے ایک نعمت سے کم نہ ہوتے تھے۔ وہ ان مکاتیب کو اپنے لیے ایک نادر تحفے سے کم تصور نہیں کرتے تھے۔ اسے آنکھوں سے لگاتے، چومتے اور اپنے پاس رکھتے۔ اکثر شاگرد یہ کیا کرتے تھے کہ جب خط بھیجتے تو اس کی پشت پر کلام بھی اصلاح کے لیے لکھ دیتے۔ امیر کو یہ عادت سخت ناپسند تھی۔ امیر کبھی محبت سے اور کبھی ترشی کے ساتھ شکایت کرتے کہ وہ یہ حرکت نہ کیا کریں۔ بشیر ملیح آبادی کو لکھتے ہیں کہ:

''خط آپ ہمیشہ غزل کی پشت پر لکھا کرتے ہیں، جس سے مجھے بہ مجبوری واپس کرنا پڑتا ہے۔ اس کی میں شکایت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ علیحدہ محبت نامہ تحریر ہوا کرے کہ میرے پاس رہے''۔ ۱۷۰؎

محمد حبیب الرحمٰن شروانی کو لکھتے ہیں:

''آپ نے غزل اپنے خط کی پشت پر لکھی تھی اور وہ پیارا خط میں کیوں کر پھیر دیتا''۔ ۱۷۱؎

زاہد حسین زاہد کو رقم طراز ہیں کہ:

''محبت نامہ آیا۔ مسرور کیا، مگر غزل اس کی پشت پر ہے لہٰذا بہ مجبوری اس سرمایہ سرور کو پھیرنا پڑا۔ چیز دیکھ کر پھیر لینا آپ نے کس سے سیکھا ہے۔ یہ روش چھوڑ دیجیے اور آئندہ ایسا ستم نہ کیجیے گا''۔ ۱۷۲؎

زاہد کو ایک بار پھر لکھتے ہیں:

''غزل اور خط ایک ہی کاغذ پر ہے۔ خط کا واپس کرنا بہت شاق ہوتا ہے۔ مگر مجبور ہوں۔ آئندہ ایسی پیاری چیز دے کر پھیر لینے کا ارادہ نہ کیجیے گا''۔ ۱۷۳؎

امیر کی عادت تھی کہ وہ اپنے تمام دکھ درد شاگردوں کو لکھتے۔ اور ان سے مشورے طلب کرتے اور پھر انھی پر عمل کرتے۔ ریاست کے حالات ہوں یا مالی پریشانیاں، بیماریاں ہوں یا کثرت سے کام کے مسائل وہ شاگردوں کو لکھتے اور دعا کے طلب گار ہوتے۔ یوں وہ اولاد کی طرح تلامذہ کو بھی اہمیت دیتے۔ خود ان کے بن کے رہتے اور انھیں اپنا بنا کر رکھتے۔ شاگرد کسی مسئلے پر الجھ جاتا تو بے تاب ہو جاتے، اسے دعا دیتے۔ احسن اللہ ثاقب نے اپنے انگلستان جانے کا تحریر کیا تو، امیر تڑپ اٹھے:

''آپ نے انگلستان جانے کی بری خبر سنائی یہ بارِ عظیم مہاجرت کا مجھ ناتواں سے کیوں کر اٹھے گا۔ خیر خداوند عالم ایسا کرے کہ آپ کو یہ سفر وسیلۂ ظفر ہو اور رافائز المرام وہاں سے آ کر ہندوستان میں وہ مرتبہ پائیں کہ آپ کے خیر طلب اس پر فخر کریں''۔۷۴؎

امیر شاگردوں کو اپنا احوال لکھتے تو خواہش مند ہوتے کہ اس کا تذکرہ کسی سے نہ کیا جائے اس طرح کہ بہت سے خطوط زاہد حسین زاہد کے پاس تھے۔ احسن اللہ ثاقب جب امیر کے خطوط مرتب کر رہے تھے تو زاہد حسین زاہد ہی نے سب سے زیادہ خطوط انھیں اشاعت کے لیے فراہم کیے۔ لیکن وہ خطوط نہیں دیے جو بقول زاہد حسین زاہد! ''جناب مرحوم نے ان کو نظر اغیار سے محفوظ رکھنے اور کسی کو نہ دکھلانے کی تاکید کر دی تھی''۔۷۵؎ اس بات کی شہادت امیر کے ایک اور خط سے بھی ملتی ہے۔ یہ بھی زاہد حسین کے نام ہے۔ ''آپ کو اپنا دل سوز سمجھ کر کچا چٹھا اپنا لکھ گیا ہوں، یہ خط نظرِ اغیار سے محفوظ رہے''۔۷۶؎

خط کے معاملے میں ایک عجیب کیفیت سامنے آتی ہے کہ انسان کے خارجی اور داخلی تمام ہی پہلو اس سے عیاں ہو جاتے ہیں۔ خط لکھنے والے کو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ یہی خطوط کبھی اس کی برتری ثابت کرنے کے لیے پیش کر دیے جائیں گے۔ یا کبھی اپنے انھی خطوط کی بدولت وہ گرفت میں بھی آ جائے گا۔ جس شخص کو یہ خطوط لکھے جا رہے ہوتے ہیں وہ عموماً بہت مخلص دوست ہوتا ہے۔ لیکن وہی مخلص، مکتوب نگار کے مرنے کے بعد، بے خیالی یا عدم احتیاط کا شکار ہو جاتا ہے اور خط کھل جاتا ہے۔ یہی امیر کے خطوط کے ساتھ بھی پیش آیا۔ جانے کتنی باتیں ہوں گی، جو امیر نے چھپا کر کہی ہوں گی۔ لیکن آج ہم انھیں سامنے رکھ کر امیر کی شخصیت کردار اور علمیت، اخلاق اور ان کی کمزوریوں پر قلم اٹھا رہے ہیں اور اپنے معیارات پر ان کی مجبوریوں سے صرفِ نظر کر کے ادب یا معاشرے میں مقام متعین کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مثلاً امیر کی تلامذہ سے محبت کے اس انداز کو دیکھیے کہ وہ حکیم محمد جعفر بیمار کے نام خط میں کیا فرما رہے ہیں:

''اب آپ کو سوائے اس کے کچھ چارہ نہیں کہ اپنے مصرع کی نسبت الزام تقدیم و تاخیر کو کاتب کے سر رکھیے اور ظاہر کیجیے کہ میں نے یوں کہا تھا''۔۷۷؎

جس طرح بعض اوقات اولاد کی غلطیوں کو معاف کرنے پر والدین مجبور ہوتے ہیں یا ان کی غلطیوں پر پردہ ڈالتے ہیں۔ تو یہ ان کی وہ حقیقی محبت ہوتی ہے، جس کے آگے وہ مجبور ہوتے ہیں۔ امیر بھی اپنے شاگردوں سے اسی قسم کی محبت کرتے تھے۔ مذکورہ بالا اقتباس اس ہی کی مثال ہے۔ بلاشبہ اردو شاعروں میں اتنا وضع دار محبت کرنے ولا استاد امیر کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ جو شاگردوں پر اتنی جان دے یا ان کے خط کے لیے تڑپے ان کے دیدار کے لیے ترسے زاہد کو لکھتے ہیں:

''پیارے زاہد اب تو ریل راج پور تک ہوگئی ہے۔ موقع ملے تو کبھی ادھر بھی آ نکلو۔ اب تو مدت ہوگئی ہے کہ نہیں دیکھا مجھ کو اپنے دیدار سے مسرور کرو''۔۷۸؎

حبیب الرحمٰن شروانی کو کس حسرت سے لکھتے ہیں:

''سفر کی فرصت مطلق نہیں ملتی اور آپ کا سفر کرنا معلوم نہیں آسان ہے یا مشکل دیکھا چاہیے حسرت ملاقات کیوں کر بر آتی ہے''۔۱۷۹

ایک اور خط میں شروانی کو لکھتے ہیں کہ: ''میں بھی آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں''۔۱۸۰ منشی ولایت علی خاں صفی کو رقم طراز ہیں کہ: ''ایک عمر ہوگئی کہ وطن جانا نہیں ہوا۔ ورنہ میں خود آ کر تم سے ملتا اور بالمشافہ تمھارے کلام کی داد دیتا۔ تم اگر چلتے پھرتے رہتے ہو تو، کبھی ادھر بھی آ نکلو کہ حسرتِ دیدار میرے دل میں نہ رہ جائے''۔۱۸۱ عابد کوثر خیر آبادی کو لکھتے ہیں:

''حکیم صاحب گیا کے سفر سے پہلے، اب کے بار دو چار دن کے لیے رام پور کو ضرور آئیں اور اپنے دیدار فرحتِ آثار سے مسرور کریں اگر ایسا نہ ہو تو مجھے نہایت حسرت رہے گی اور ملال رہے گا''۔۱۸۲

خطوط سے پتا چلتا ہے کہ عابد کوثر خیر آبادی امیر کی خواہش پوری نہ کر سکے تھے۔ یہ بات ۱۱ر دسمبر ۱۸۹۲ء کی ہے۔ تقریباً تین سال بعد ۱۲ر اکتوبر ۱۸۹۵ء کے خط سے پتا چلتا ہے کہ کوثر نے امیر سے ملاقات کا ارادہ کیا ہے۔ امیر ایک انمول خوشی اور حسرت کے ملے جلے جذبات سے لکھتے ہیں کہ:

''مدت کے بعد آپ کا یہاں آنے کا اور مجھے اپنے دیدار فرحت آثار سے مسرور فرمانے کا ارادہ ہوا۔ یہ وہ آرزو ہے کہ ہمیشہ اللہ سے چاہتا تھا۔ خداوند تعالیٰ آپ کے ارادے اور میری آرزو کو پورا کرے۔ آپ خیر و عافیت کے ساتھ آئیں اور جلد آئیں کہ دل بے قرار اور آنکھیں محو انتظار ہیں''۔۱۸۳

امیر کے کردار کی یہ بہت بڑی خوبی تھی کہ ان کا رویہ تمام شاگردوں کے ساتھ یکساں تھا۔ ہم نے گزشتہ صفحات میں جو بھی اقتباس پیش کیے ہیں وہ مختلف شاگردوں کے نام خطوط سے ہیں سب کے ساتھ ایک سی محبت ایک سا برتاؤ ثابت کرتا ہے امیر نیک سیرت اور با کردار استاد تھے۔ وہ تلامذہ سے شکوے بھی کرتے اور ان کی ناز برداری بھی۔ ناراض ہو جاتے تو انھیں مناتے۔ ان کا یہ رویہ بھی سب کے ساتھ یکساں تھا۔ برہم کے نام ۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء کے خط کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

''پیارے برہم لکھ کر پچتا رہا ہوں کہ برہمی پیارے ہونے کی چیز کہاں ہے کہ میں نے پیارے برہم القاب میں لکھا پھر یوں دل کو تسکین دیتا ہوں کہ کسی کی برہمی بھی تو کسی کو مزا دے جاتی ہے''۔۱۸۴

اب برہم کے نام ۲۳ر اگست ۱۸۹۵ء کے خط میں امیر کا شکوہ بھی ملاحظہ ہو:

''تم نے بے شک مجھے اپنے دل سے بھلا ڈالا ہے کہ مجھے برسوں یاد نہیں کرتے ہو۔ مگر اس پر بھی میرا محبت منزل دل تم کو نہیں بھولا، گو یہاں سب موانع تو یہ کے تحریر کی نوبت نہیں آتی۔ مگر تمھاری یاد بالکل نہیں جاتی۔ تم سے اور تمھارے خطوط سے تمھاری یاد ہی اچھی۔ اب جو تم نے اپنی ملاقات سے مسرور کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ خدا تمھارے وعدے کو پورا کرے جو تمھارا وعدہ ہے وہی میری تمنا ہے''۔۱۸۵

یہ تھی استاد کی ناراضی اور شکوہ کہ ایک لمحے میں راضی بھی ہو گئے۔ اب امیر کی شفقت کا ایک اور انداز ملاحظہ کیجیے۔

یہ ۸؍ستمبر ۱۸۹۷ء کا ہے:

''پیارے برہم! اس وقت سلام و دعا سب ندارد، اس لیے کہ ایک تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ رائے سین کے انسپکٹر ہو گئے۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم سخت ناچار و مضطر ہو گئے۔ اب دردِ دل کس کو لکھیں، کس کی رسائی ذہن کے امید گاہ میں رسائی تقدیر کی امید رکھیں: خدا سے دعا ہے کہ ا جہاں رہیں خوش رہیں اور ہمیشہ اپنی خوشی سے خوش ہونے والوں کا دل خوش کیا کریں''۔ ۱۸۶؎

انسپکٹر ہونے کے بعد برہم نے کوئی خط نہیں لکھا تو امیر خود ان کی خیریت حاصل کرنے کے لیے رقم طراز ہیں:

''اب آپ کس حال میں ہیں، کیسا مزاج ہے؟ اور میں آپ کی صحت کے لیے ہر وقت دست بہ دعا ہوں اور کچھ کیفیت دریافت نہ ہونے سے متردد ہوں''۔ ۱۸۷؎

امیر کا اپنے تلامذہ کے ساتھ انسیت و محبت کا یہ رویہ ان کی فطرت کے علاوہ اس نظامِ تربیت کا حصہ بھی تھا، جو خانقاہوں کی دین ہے۔ چوں کہ امیر بھی اسی ماحول کے پروردہ تھے اس لیے انھوں نے اپنے شاگردوں کو بھی اسی ماحول میں ڈھال لیا۔ اصل میں یہی وہ تہذیب یافتہ نظام ہے جو ہر دور کے ترقی یافتہ نظام کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس لیے وہ شاگرد جو امیر جیسے اساتذہ کے زیرِ اثر رہتے ہیں انھیں پرآشوب حالات بھی علم و ادب کی حقیقی روح سے جدا نہیں کر سکے۔

(۱۱)

تلامذہ امیر کے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بیشتر شاگردوں کا شمار امراء میں ہوتا تھا اور بہت سے صاحب حیثیت اور صاحبِ ثروت تھے۔ لیکن امیر دیگر شعراء کی طرح تلامذہ سے کبھی وظیفہ حاصل کرنے کے خواہش مند اور بے قرار نہیں ہوئے۔ حالاں کہ دربار رام پور سے جتنی آمدنی تھی۔ اس سے کہیں زیادہ ان کا خرچ تھا۔ ان کے داماد سمیت تمام صاحب زادے بے روزگار تھے۔ لیکن امیر کے خطوط گواہ ہیں کہ وہ ایک باوقار اور اعلیٰ ظرف استاد تھے۔ متاعِ ہوس ان کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ اسی کسمپرسی میں بھی انھوں نے شرافت اور عزت و وقار کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ انھوں نے اپنے حالات سے تنگ آ کر یہ طریقہ اپنایا تھا کہ بعض شاگردوں کے توسط سے امراء تک رسائی حاصل کرتے تھے اور صاحبِ ثروت اشخاص سے تعلقات کو اہمیت دیتے تھے۔ لیکن اس سے امیر کا مقصد وہ نہیں تھا جو عموماً شعراء کا رہا ہے۔

امیر، ایسے افراد سے رسائی کی کوششیں کرتے، جنھیں شعر و ادب کا شوق ہوتا تا کہ وقتِ ضرورت ''امیر اللغات'' کے لیے مالی امداد حاصل کی جا سکے۔ یا لغت اور اپنی کتابیں فروخت کی جا سکیں۔ امیر، تعلقات مراسم پیدا کرنے کے لیے یہ کرتے تھے کہ خوشی یا غمی کے موقعے پر قطعات لکھ کر شاگردوں کے توسط سے انھیں بھیجتے۔ کیوں کہ امیر کو اپنے منصب اور مرتبے کا ادراک تھا اور امراء، امیر کے منصب اور مرتبے کی وجہ سے ان کے اس برتاؤ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ اس لیے یہ تدبیر زیادہ تر کارگر ہوتی تھی۔ برہم کے نام خط میں امیر رقم طراز ہیں کہ:

''باوجود تپ لرزے میں مبتلا ہونے کے، دو تاریخیں ایک فارسی اور ایک اردو لکھ کر قاضی صاحب کی خدمت میں بھیج دیں''۔ ۱۸۸؎

برہم کے نام ایک اور خط میں امیر لکھتے ہیں:

''جناب قاضی صاحب کے مژدۂ صحت سے آپ نے سامعہ نوازی کی۔ میں بہت خوش ہوا۔ میری طرف سے تہنیتِ صحت کسی موقع پر ادا کی جائے گی''۔۱۸۹

امیر مختلف ریاستوں یا امراء سے تعلقات ومراسم کے لیے جن شاگردوں کو ذریعہ بناتے تھے، ان پر خصوصی توجہ بھی کیا کرتے تھے۔ خاص کر کلام پر اصلاح جلد ہو جاتی تھی۔ بلکہ امیر، برہم کو ایک مرتبہ یہاں تک لکھ گئے کہ: ''تم پہلے مجھے مطمئن کرو پھر جتنا کلام چاہو بھیجو''۔۱۹۰ امیر کے ایک اور خط میں مذکور ہے کہ: غزل پر اصلاح توجہ سے ہوگی بشرطیکہ اصلاح مثنوی معلومہ کا عمدہ نتیجہ تمھاری کوشش سے ظہور پذیر ہو''۔۱۹۱ اس موقعے پر یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ''دفتر اللغات'' کا بجٹ امیر کی تنخواہ سے کہیں زیادہ تھا۔ (جس کی بابت تفصیل سے معلومات کسی اور موقعے میں پیش کی جائیں گی اور پھر ایک بہت بڑے کنبے کا خرچ (بقول اسمٰعیل احمد مینائی مرحوم: ''ستر سے زیادہ افراد پر امیر کا خاندان مشتمل تھا۔) یہ سب کچھ آسان نہ تھا اور پھر اس پر امیر کی حد درجہ بیماریاں ان تمام حالات کے سبب سے وہ شعروشاعری سے بھی بے زار ہو گئے تھے۔ ہر علمی کام طبیعت پر جبر کر کے انجام دیتے تھے۔ الغرض امیر کی زندگی کی یہ تمام روداد و کیفیات ان کے مکاتیب میں ملتی ہیں۔ حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام خط میں مذکور ہے کہ: ''شاعری کا مشغلہ بہت دنوں سے ترک تھا۔ اب تلامذہ کے کلام کی اصلاح بھی متروک ہے۔ الا ماشاء اللہ رعشہ اپنے ہاتھ سے لکھنے نہیں دیتا''۔۱۹۲ زاہد کو اپنے حال کی بابت لکھتے ہیں: ''میں ایک پیرانہ سال شکستہ حال ہیچمدان بعض ہوں اور شاعری سے بیگانہ ہو گیا ہوں''۔۱۹۳ حفیظ جون پوری کو لکھا کہ:

> ''اب شاعری نے مجھ کو اور میں نے شاعری کو چھوڑ دیا آپ کے اصرار سے مجبور ہو کر آپ کی ضرورت پر نظر کر کے میں نے اپنی طبیعت پر جبر کیا اور دونوں غزلیں دیکھ لیں''۔۱۹۴

اسی نوعیت کی کیفیات کو ثر خیر آبادی کے نام خط میں بھی ملتی ہیں: ''شعروسخن کا مشغلہ قطعی ترک ہو گیا۔ بلکہ اس کے ذکر سے نفرت ہوتی ہے''۔۱۹۵ حافظ غلام احمد فروغی کے نام خط میں رقم طراز ہیں:

> ''آپ اپنے مشاعرے کے لیے مجھ سے غزل فرماتے ہیں۔ میں اس زمانہ میں بہت ہی رنجور اور معذور ہو رہا ہوں۔ خود بیمار اور کئی بیماروں کا پرستار ہوں ... شعروسخن کا مشغلہ مجھ سے بالکل چھوٹ گیا ہے۔ آپ کے حسنِ اخلاق سے امید ہے کہ عذر میرا قبول کر کے مجھ کو معاف فرمائیں گے''۔۱۹۶

امیر کا ان حالات میں عزت ووقار کے ساتھ زندہ رہنا، ایک معجزہ ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں اگر امیر شاگردوں کی مدد لیتے تھے اور امراء سے بہ ضرورت مراسم رکھتے تھے تو یہ ان کی انتہائی مجبوری تھی اور یہ ایسی کوئی اخلاقی برائی بھی نہیں تھی۔ امیر کے اس دور میں بہت سے شاگردوں نے بھرپور معاونت کی اور بعض قریبی شاگردوں نے ساتھ چھوڑ دیا۔ جن کی وجوہات کا پتا نہیں چلتا۔ جس کا امیر کو بڑا رنج رہتا تھا۔ امیر کے ایک خط سے مہدی حسن شاداب کے متعلق صرف اتنا ہی پتا چلتا ہے کہ: ''احباب نے جو کچھ کہا وہ خیال نہ کیا۔ حضرت شاداب نے رسم قدیمہ یک قلم ترک کر دی''۔۱۹۷ وسیم خیر آبادی ''دفتر اللغات'' میں ملازم تھے۔ امیر کے خاص شاگردوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ کسی بات پر وہ بھی ملازمت چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ غالباً تنخواہ کا کوئی مسئلہ تھا۔ وسیم کے نام امیر کے ایک خط سے اس طرف کچھ اشارہ ملتا ہے:

''میاں وسیم! تمھاری پریشانی سے مجھ کو بھی پریشانی ہوئی۔ سوائے کام چھوڑ کر چلے جانے کے اور جو بات امکانی ہو۔ تم مجھ کو نہ بتاؤ تو میں کیا کروں۔ میں کسی حالت میں اپنے عزیز، اپنے دوست کا نقصان نہیں چاہتا۔ مگر تم خود سمجھتے ہو کہ (امیر اللغات) کا ایک حصہ مکمل ہونے تک تمھارے جانے سے اس کام کو نقصان سخت پہنچے گا۔ آئندہ تم کو اختیار ہے، تم بجائے خود خوب سوچ کر جو درخواست، قابل قبول، مجھ سے کرو۔ اس میں حاضر ہوں اور تمھاری راحت سے بہ حلف لکھتا ہوں کہ مجھے راحت ہوتی ہے اور تمھاری تکلیف سے تکلیف''۔ ۱۹۸

اس خط کے بعد غالباً وسیم دفتر آ گئے تھے۔ لیکن پھر ڈیڑھ سال گزار کر چلے گئے۔ (ہوسکتا ہے کہ امیر سے ان کا یہی معاملہ طے پایا ہو۔) برہم کے نام ۷/جون ۱۸۹۱ء کے خط میں لکھتے ہیں: ''وسیم ایک برس سے اس دفتر میں نہیں ہیں۔ راجہ جو نپور کی سرکار میں نوکر ہیں۔ سال بھر کے بعد کل ان کا ایک خط آیا''۔ ۱۹۹ ۲۲/جولائی ۱۸۹۴ء کے خط میں حفیظ جون پوری کو نہایت حسرت سے لکھتے ہیں: وسیم کا حال مجھے بھی مدت سے معلوم نہیں کہ کہاں ہیں اور کس فکر میں ہیں۔ اب مجھے وہ خط بھی نہیں لکھتے''۔ ۲۰۰ امیر کے ایک خط سے یہ تو پتا چلتا ہے کہ شاداب نے بعد میں رابطہ کر لیا تھا۔ لیکن وسیم کے متعلق اس طرح کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔

امیر کے ایک اور شاگرد نواب عالم گیر محمد خان (جنھیں امیر نے جلال کے نام خط میں جانے کیوں لکھا کہ: ''میرے شاگرد نہیں''۔) نے بھی امیر سے وفا نہیں کی۔ جلال لکھنوی کے نام خط میں امیر لکھتے ہیں:

''نواب عالم گیر محمد خان میرے شاگرد نہیں۔ کئی برس سے رسمِ مراسلت تھی۔ جب بھوپال جانے کا اتفاق ہوا تو دو ایک ملاقاتیں ہوئیں۔ واپسی کے بعد سے رسمِ قدیمہ مراسلت میں بھی فرق آیا۔ اب جو خط جاتا ہے۔ جواب نہیں آتا•••

میرے چار قصیدے جو میں نے نواب عالم گیر محمد خان کے ذریعے پیش کرنے کے لیے بھیجے تھے۔ آخر میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک سرکار عالیہ تک پہنچا اور تین کا پتا نہیں کہ کیا ہوئے''۔ ۲۰۱

امیر کے نواب عالم گیر سے تعلقات ممکن ہے، اسی لیے متاثر ہوئے ہوں کہ وہ ذمہ دار فرد ثابت نہیں ہوئے۔ ورنہ امیر تو تلامذہ اور دوستوں کے ناز اٹھانے والے انسان تھے۔ شاداب، وسیم، نواب عالم گیر کے علاوہ برہم کے نام مکاتیب سے پتا چلتا ہے کہ ان کے یہ شاگرد بھی کچھ غیر ذمہ دار واقع ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے امیر اکثر پریشان رہتے تھے۔ برہم کے نام مکاتیب میں، امیر کی کسمپرسی اور تنگ دستی کی ایک اذیت ناک صورتِ حال ملتی ہے۔ جنھیں پڑھ کر برہم کی غیر ذمہ داری کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ امیر کے بعض سخت جملے ان کے ذہنی کرب اور برہم کی بے پروائی کا آئینہ دار ہیں۔ مثلاً:

''باتوں میں خوش کر دینا تو تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ جان من ایسی کوشش کرو کہ کام نکلے۔ ہاتھ چلے۔ تنگ دستی نے تنگ دست کر رکھا ہے•••

در خانہ اگر کس ست
یک حرف برونِ سپاس بس ست''۲۰۲

ایک خط میں مذکور ہے:

''میرے بہلا دینے کی تو تم کو ہزار راہیں آتی ہیں، جب قلم اٹھاؤ گے بہلا لو گے۔۔۔ حکیم صاحب حکمت کی باتیں تم کو بہت آتی ہیں۔ کام کی بات ایک نہیں آتی۔ سچی بات لکھی ہے۔ برہم نہ ہو جانا''۔۲۰۳

شاگردوں کے اس رویے کے باوجود، امیر ان سے بدگمان نہیں تھے۔ جب موقع ملتا اپنے ناراض شاگردوں کی دل جوئی کرتے اور ان کی بابت باخبر رہنے کی کوشش بھی۔ خاص کر حکیم برہم کے امیر نے بہت ناز اٹھائے۔

امیر اپنے اس شاگردوں کے مزاج کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اس لیے ان سے نرم گرم رویہ رکھتے تھے جیسا کہ اکثر بڑوں کا چھوٹوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ امیر کے زیادہ تر شاگرد فرماں بردار اور مخلص تھے۔ برہم کا شمار بھی انھی تلامذہ میں ہوتا ہے۔

(۱۲)

امیر، شاگردوں سے ''امیر اللغات'' کی تالیف کے علاوہ مالی معاونت اور اپنی کتابوں کی فروخت میں بھی مدد لیا کرتے تھے اور اکثر شاگرد بہت توجہ اور دیانت داری سے یہ خدمت انجام دیا کرتے تھے۔ ان میں بعض شاگرد تو ایسے تھے کہ امیر کے کہنے پر بصدِ خلوص آگے بڑھتے اور بعض مثلاً زاہد حسین زاہد، احسن اللہ ثاقب، امتیاز احمد خاں راز اور برہم وغیرہ از خود آگے بڑھ کر استاد کی معاونت کرتے تھے۔ امیر، ۲۸ر مارچ ۱۸۹۱ء کے خط میں برہم کو لکھتے ہیں: ''صنم خانہ عشق'' کو چندے ابھی اور رہنے دو''۔۲۰۴ اس کے بعد پھر ۲۲ر نومبر ۱۸۹۵ء کے خط میں دیوان کے مرتب ہونے کی اطلاع اور ''امیر اللغات'' کی رقم کا تقاضا لکھتے ہیں:

''صنم خانہ عشق'' کو نظرِ ثانی سے میں نے مکمل و مہذب کر لیا ہے۔ کچھ کسر باقی ہے۔۔۔ اس کو اشاعت وغیرہ میں مدد دینے اور خریدار بہم پہنچانے کی نسبت تمھیں کچھ لکھنے کی حاجت نہیں۔۔۔ اور ہاں اب ''امیر اللغات'' کے روپے تو بھیج دو۔ تم نے بڑی دیر کی۔ بڑی ضرورت ہے''۔۲۰۵

امیر اپنے دیوان کی فروخت کے لیے مولوی محمد اعجاز کو لکھتے ہیں:

''دیوان چھپ کر مطبع سے آ گیا۔ اب جس پتے کو کہو پانچ جلدیں تمھارے لکھنے کے موافق تمھارے نام سے بھیجی جائیں۔۔۔ مکرر یہ کہ کوشش کر کے خریدار بہت سے پیدا کرو، ہزار جلدیں چھپوائی گئی ہیں، بغیر اس کے کہ تم سے دل سوز، دل سے کوشش کریں، ان کا نکلنا دشوار ہے''۔۲۰۶

امیر کے دیوان کی فروخت کا ذمہ منشی امتیاز احمد خاں راز نے اٹھایا تھا۔ کسی وجہ سے وہ اس کی قیمت وقت پر نہ بھیج سکے۔ امیر اپنے ایک خط میں قیمت کا تقاضا کرتے ہیں: ''قیمت دیوان کے واسطے پھر مکلف ہوں کہ جس قدر فراہم ہو گئی ہو جلد بھیج دو''۔۲۰۷

امیر اللغات کی تالیف و تدوین، اشاعت اور فروخت کے لیے بھی تلامذہ کی مدد حاصل کرتے تھے اور شاگرد پر جوش ہو کر معاونت کرتے تھے۔ امیر اللغات کی دھوم اشاعت سے پہلے ہی ہو گئی تھی۔ چناں چہ شاگرد اپنے خطوط میں اس کی اشاعت

کی بابت دریافت کیا کرتے تھے۔ اسی نوعیت کے کسی سوال کے جواب میں امیر برہم کو لکھتے ہیں کہ: ''امیر اللغات'' کی تکمیل جلد منظور ہے تو کسی حکمت سے ایک لاکھ روپیہ دلوائیے، پھر دیکھیے کتنے جلد حصے نکلتے ہیں''۔ ۲۰۸؎ الغرض ''امیر اللغات'' کی اشاعت کے بعد شاگردوں نے اس کی فروخت میں بھرپور شرکت کی یہی وجہ ہے کہ چند ہی سال میں ''امیر اللغات'' کے دونوں حصوں کی طباعت دوسری مرتبہ بھی ہوئی۔

اس موقعے پر اس امر پہ بھی توجہ ضرور مرکوز کرنا چاہیے کہ ''امیر اللغات'' کو کاروبار کی غرض سے شائع نہیں کیا گیا تھا۔ یہ تو نوابینِ رام پور کی خواہش ومنشا کا کام تھا۔ لیکن امیر نے یہ اپنے خرچ سے کیا۔ حالاں کہ ریاست رام پور نے امیر سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی اشاعت کا بندوبست، سرکار کرے گی۔ لیکن لغت کے لیے معاونت اس طرح ہوئی کہ امیر کو قرض دیا گیا یہ کہہ کر کہ اس کی ادائیگی لغت فروخت کر کے کی جائے۔ لیکن بعض وجوہ کی بنا پر لغت کے کام میں تعطل آیا اور قرض بڑھتا گیا۔ امیر کی اس مجبوری سے تقریباً ان کے تمام تلامذہ واقف تھے۔ چناں چہ شاگردوں نے حق شاگردی ادا کرتے ہوئے استاد کی مدد کی۔ ظاہر ہے یہ امیر کا رویہ ہی تھا، جس کی بدولت شاگردوں کے دل میں بھی ان کے لیے درد تھا۔ اسی لیے تلامذہ نے لغت کی فروخت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ جہاں تک دیوان کی اشاعت کا تعلق ہے، تو یہ بھی شاگردوں کی بار بار فرمائش اور تعاون ہی سے ممکن ہوا۔ ورنہ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اس عظیم شاعر کے دواوین بھی غیر مطبوعہ ہی رہ جاتے۔ امیر برہم کو لکھتے ہیں: ''صنم خانۂ عشق'' کو نظر ثانی سے میں نے مکمل ومہذب کر لیا ہے۔ کچھ کسر باقی ہے بعض احباب سخت مصر ہیں کہ چھپے''۔ ۲۰۹؎ زاہد حسین کو لکھتے ہیں کہ: ''صنم خانۂ عشق''، نظر ثانی سے مہذب ومکمل ہو گیا ہے۔ کچھ کسر باقی ہے۔ بعض تلامذہ کا اصرار اس کے طبع کی نسبت بدرجہ غایت ہے، جس سے امید کی جاتی ہے کہ اب کے چھپ ہی کے رہے گا''۔ ۲۱۰؎

الغرض امیر کا دیوان شاگردوں ہی کی کوششوں ہی سے شائع ہوا اور فروخت بھی۔

امیر کو لغت کی تالیف میں کتابوں کی بھی اشد ضرورت رہتی تھی۔ ''دفتر امیر اللغات'' کے وسائل اتنے نہ تھے کہ بہ کثرت کتابیں خریدی جائیں۔ چناں چہ امیر، کتابوں کے حاصل کرنے میں بھی تلامذہ سے مدد لیتے تھے۔ وہ شاگردوں کے کتب خانوں کی فہرستیں منگاتے اور حسبِ ضرورت کتاب مستعار منگوا لیتے اور پڑھنے کے بعد واپس کر دیتے۔ کسی خاص کتاب کی تلاش ہوتی تو اس میں بھی امیر اپنے تلامذہ سے مدد حاصل کرتے اور ملک بھر میں پھیلے ہوئے شاگردوں سے کتاب تلاش کراتے۔ کتاب مل جانے کی صورت میں کسی شاگرد کے ذریعے سے اس کی نقل حاصل کرتے۔

امیر اس نوعیت کے کاموں سے اپنے تلامذہ میں علم کی لگن پیدا کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی طرح ان کے شاگرد بھی کتابوں کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔ امیر کے نزدیک کتاب عمدہ خوش خط ہونے سے نہیں بلکہ اچھے مواد اور موضوع سے ہوتی ہے۔ زاہد کے نام خط میں رقم طراز ہیں:

> ''اگر عمدہ کتابیں ہوں تو اپنے کتب خانہ میں غور کر کے اچھی اچھی کتابوں کی فہرست ضرور بھیجیے اور عمدہ کتاب میرے نزدیک مطلا و مذہب اور بہت خوش خط ہونے سے نہیں ہوتی، بلکہ فی نفسہ مافی الکتاب کے حسن پر نظر رہے''۔ ۲۱۱؎

ایک اور موقعے پر لکھتے ہیں کہ:

''ذرا مہربانی کر کے اپنے کتب خانہ کی فہرست بھجوایے، شاید کوئی کتاب مجھے مطلوب ہو تو مستعار لینے کی درخواست کروں اور نقل لے کر باحتیاط بھیج دوں''۔۲۱۲

حبیب الرحمٰن شروانی کے نام خط میں ہے: ''اپنے کتب خانہ کی فہرست بھیجئے تو شاید کوئی کتاب مفید مجھ کو مستعار مطلوب ہو''۔۲۱۳

امیر شاگردوں کے علاوہ دیگر فضلاء کے کتب خانوں کی فہرستیں بھی منگواتے تھے اور ضرورت کی کتابوں کی نقل حاصل کرتے۔ صفیر بلگرامی کی کتاب ''جلوہ خضر''، حصہ دوم کی تلاش تھی۔ وہ منشی محمد اعجاز حسن کے ذریعے سے حاصل ہوگئی۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ اس کتاب کے دو حصے مزید ہیں۔ چناں چہ امیر نے اعجاز کو لکھا کہ جو دو حصے غیر مطبوعہ ہیں اگر نقل کے لیے مل جائیں تو بہت اچھا ہو اور اگر نہ مل سکیں تو وہیں سے نقل لینے کا بندوبست کیا جائے:

''جلوہ خضر کے دو حصے اور ہونا اس حصہ دوم سے معلوم ہوا۔ شاید ان کے چھپنے کی نوبت نہ آئی ہوگی۔ اگر آپ کی کوشش سے، قلمی دونوں حصے نقل کے واسطے مل سکیں تو بہت ہی جی خوش ہو اور اگر صفیر مرحوم کے جانشین مستعار نہ دیں تو وہیں نقل لینے کا بندوبست کیا جائے اور ان کے کتب خانے کی فہرست بہم پہنچانے میں مدد بھی۔ سعی کرنا باعثِ سنت ہوگا''۔۲۱۴

ایک اور خط میں منشی محمد اعجاز حسن کو ''مقاصد حسنہ'' کے لیے لکھتے ہیں کہ: ''مقاصد حسنہ کا نسخہ اب تک مجھے نہیں ملا، تلاش میں ہوں''۔۲۱۵ پھر ''سخن دانِ فارس'' کے لیے لکھتے ہیں: ''سخن دانِ فارس کا ذکر آگے آپ نے لکھا تھا۔ چوں کہ دفتر ''امیر اللغات'' میں اس کی حاجت ہے، اس لیے چاہتا ہوں کہ جس مطبع سے اس کا ملنا ممکن ہو مجھے آگاہ کیجئے''۔۲۱۶ مولوی محمد ریاض حسن خاں کے نام امیر کا ایک مکتوب اس لحاظ سے نہایت اہم ہے کہ اس سے امیر کا کتابوں سے شوق و اشتیاق اور شاگرد کی فرماں برداری کا پتا چلتا ہے۔

''صفیر مرحوم کے پاس شاعری سے متعلق کتابیں خصوصاً کلیات و دواوین شعرائے سلف بہت تھے۔ معلوم نہیں ان کے اعقاب میں کوئی ان سے منتفع ہوتا ہے یا نہیں اور مجھ سا مشتاق ان کتابوں میں سے کوئی کتاب مستعار پا سکتا ہے یا نہیں۔ خیر، اگر ممکن ہو تو ان کے کتب خانے کی فہرست منگوا کر ایک نقل اس کی مجھے بھیج دیجیے اور بعد مطالعہ فہرست جن کتابوں کا میں طالب ہوں اپنی ذمہ داری سے ان کو مستعار دلوانے میں کوشش کیجیے۔ ''دفتر اللغات'' میں کم یاب و نایاب دواوینِ شعرائے گزشتہ کی بہت حاجت رہتی ہے۔ آپ لوگوں کی سعی جمیل بہت باعثِ شکر گزاری ہوگی''۔۲۱۷

الغرض امیر کی تربیت اور شاگردوں کی امیر سے حقیقی انسیت نے ایک ایسا علمی حلقہ پیدا کر دیا تھا، جو معاشرے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جس کے لیے اجتماع کی ضرورت ہوتی ہے اور اس اجتماع کا کسی ایک نکتے پر متفق ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں بالخصوص اجتماع تو ہو جاتا ہے لیکن وہ کسے نکتے پر متفق نہیں ہو پاتا۔ اس لیے چھوٹے اور بڑے کام جو معاشرے کے لیے ضروری تھے ہو ہی نہیں سکے۔ کام نہ ہونے کی بڑی وجہ نیت بھی ہے۔ عموماً ناکامی کی ایک صورت سالار کی بدنیتی بھی ہوتی ہے۔ امیر مینائی کی شخصیت و کردار نے ایک ایسا بڑا علمی قبیلہ تیار کیا جو

امیر پر کلی طور پر اعتماد کرتا تھا۔ یہ ایک بڑی مثال بھی ہے اس حوالے سے کہ ادیب و شاعر بھی فلاحی مملکت میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ نیک نیت ہوں اور بلاشبہ امیر نے یہ کر دکھایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھوں نے قومی شاعری کا ایسا کوئی تصور پیش نہیں کیا، جو ملک و قوم کے لیے راستے متعین کرتا۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنی شخصیت کے سحر سے ایسے لوگ تیار کیے جو معاشرے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ایسے اساتذہ تیار کیے جو مکتب کے لیے اطمینان کا باعث ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہمارے معاشرے میں استاد و شاگرد کی اس روایت کو زندہ رکھا جو ہماری قابل فخر شناخت ہے۔ جس کے ڈانڈے اہل صفہ سے جا ملتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ اہل صفہ کی روایات پر عمل کی بدولت معاشرے میں اچھے انسان پیدا ہوتے ہیں۔ امیر کا کردار اور تربیت کا انداز ثابت کرتا ہے کہ وہ اچھی روایات کے امین تھے۔ چناں چہ امیر کی کام یابیوں میں یہ بھی ایک بڑا محرک قرار دیا جا سکتا ہے۔

امیر اور ان کے شاگرد خلوص اور محبت کے جس رشتے سے بندھے ہوئے تھے۔ اس کی تفصیلات کا بیان مشکل تو نہیں، لیکن اتنا آسان بھی نہیں۔ کیوں کہ جس طرح امیر، شاگردوں کے لیے تڑپ رکھتے تھے اس طرح ان کے شاگرد بھی۔ گزشتہ صفحات میں امیر کے علاوہ شاگردوں کا امیر سے برتاؤ بھی پیش کیا گیا۔ جس میں خود غرضی نہیں ایثار ہی نظر آیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خلوص و محبت اور ایثار کی شہادتیں مکاتیب امیر میں جا بجا بکھری ہوتی ہیں۔

اب ذیل میں استاد اور شاگرد کے تعلقات اور خلوص و محبت کا ایک اور رخ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱۳)

امیر ریاست رام پور میں ایک اہم منصب پر فائز تھے۔ پھر انھیں نواب کلب علی خاں کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے ایک بااثر خاندان سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے ریاست سمیت ملک بھر میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ جس کی وجہ سے امیر کا دیگر رؤسا اور نوابین وغیرہ میں تحفے و تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا تھا۔ امیر کے پاس بھی قیمتی تحفے آیا کرتے تھے، اس لیے امیر کی بھی خواہش ہوتی تھی کہ وہ بھی عمدہ تحفے کا جواب، بہترین تحفے کی صورت میں دیں۔ امیر فطرتاً نفاست پسند اور سلیقے مند انسان تھے ایسی ویسی اشیاء تو ان کی نظر میں جچتی ہی نہ تھی چناں چہ وہ قیمتی یا منفرد چیزوں کے لیے شاگردوں سے مدد لیا کرتے اور ادائیگی پر زور دیا کرتے تھے۔ بعض مرتبہ تلامذہ بھی قیمتی اشیا، تحفے میں اپنے استاد حضرت امیر مینائی کی خدمت میں پیش کرتے۔ جو امیر اکثر کسی اور کو تحفے میں بھیج دیتے تھے۔ بشیر ملیح آبادی کے نام خطوط میں اسی نوعیت کی بہت سی باتوں کا پتا چلتا ہے:

> ''ادھر امسال آم بہت کم ہیں اور مجھے حسب مراسم قدیم بعض عالی مرتبہ رؤسا کو ہدیتاً بھیجنا ہوتا ہے۔ چناں چہ ان آموں کو بہت سمجھ کر ایک جگہ روانہ کر دیا۔ آپ سے یہ بات دریافت کرنا ہے کہ عمدہ لنگڑا آپ کے باغوں میں کچھ مل سکتا ہے یا نہیں یا اور باغوں میں بہ قیمت کس نرخ سے خرید ہو سکتا ہے۔ اپنے کھانے کو اور ہدیہ کرنے کو مطلوب ہے''۔ ۲۱۸

زاہد حسین زاہد کو چاول، بھینس اور سر کا خریدنے کے لیے رقم طراز ہیں کہ:

> ''جس جس قسم کے چاول وہاں اچھے ہوتے ہیں، وہ تھوڑے تھوڑے سے بجھوا دیجیے•••

ایک عمدہ بھینس جو غریب وشائستہ قوم کی اچھی۔ کم سے کم سات سیر دودھ دیتی ہو اور کمال صلاحیت غریب سے گھر میں پل سکتی ہو۔ قیمت چالیس پچاس تک دینا منظور ہے۔ بشرطیکہ مال زیادہ کا ہو••• چار پانچ گھڑے سرکے، کے بھی اچار کے واسطے درکار ہیں•••

روپیہ چاولوں کی قیمت کا اور بھینس کی قیمت کا یہاں فوراً ملے گا•••''۔۲۱۹

امیر کو بیماری کے باعث اکثر دواؤں کی ضرورت رہتی تھی اور بعض نسخوں کے لیے جڑی بوٹیوں کی بھی۔ چناں چہ وہ خط لکھ کر شاگردوں کے ذریعے منگوا لیتے تھے اور شاگرد بصدِ خلوص واحترام امیر کا خیال رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ امیر کو ایک نسخے کے لیے پٹھے کی ضرورت تھی، جو احسن اللہ ثاقب کے علاقے میں ملتا تھا۔ اس لیے انھوں نے ثاقب کو لکھا کہ: ''روحی فداک ایک پٹھے کی مجھے ضرورت ہے۔ ایک عرق کا نسخہ اس کے بغیر کھینچ نہیں سکتا••• خیال آیا کہ آپ کو تکلیف دوں''۔۲۲۰ امیر کے شاگرد حفیظ جون پوری کا مشغلہ عطر کی تجارت کا تھا۔ امیر ان سے قیمتاً عطر لینے کی بات لکھتے ہیں:

''سنتا ہوں کہ آپ کو کچھ عطر کی تجارت کا مشغلہ رہتا ہے، چوں کہ یہاں عطر کی اکثر حاجت رہتی ہے اس لیے آپ کو تکلیف دیتا ہوں کہ دو تین قسم کے عمدہ عمدہ عطر اس موسم کے موافق بطور [نمونہ] روانہ کیجیے اور قیمت بھی لکھیے، پسند آنے پر پھر بقدر حاجت آپ سے منگوایا جائے گا''۔۲۲۱

مولوی محمد اعجاز حسن خان سے قفلی دار نیچوں کی فرمائش میں لکھتے ہیں کہ: ''مجھے قفلی دار چند نیچے مطلوب ہیں اور ایک نیچہ پیچوان کا''۔۲۲۲ امیر نے ایک اور خط میں پھر نیچوں کی فرمائش لکھی اس لیے کہ یہ چیز رسول پور ضلع مظفر پور ہی میں ملتی تھی۔

'' تاروں سے بنے ہوئے نیچے، جو خاص اسی ملک میں بنتے ہیں مجھے درکار ہیں۔ اگر آپ مہربانی کر کے بھیج دیں تو باعثِ منت پذیری ہے''۔۲۲۳

زاہد حسین زاہد کو کملوں کے لیے لکھتے ہیں کہ: ''خدا آپ کو اطمینان دے تو میرانی پوری عمدہ کملوں کی فکر کیجیے''۔۲۲۴

ایک اور خط میں میووں کی فرمائش کرتے ہیں:

''میووں کی فہرست میں نے دیکھی۔ بالفعل مجھ کو عمدہ اناس اگر بڑے ہوں تو بیس اور چھوٹے ہوں تو چالیس مطلوب ہیں۔ ایک عالی شان امیدگاہ کا مربہ تیار کروا کے بطور پیش کش بھیجنا ہیں''۔۲۲۵

قیام لکھنؤ کے زمانے میں اسیر، امیر کے ہاں مہمان آنے والے تھے۔ اسیر تمبا کو کا استعمال کرتے تھے، اس لیے تمبا کو کی ضرورت ہوئی تو امیر نے کوثر خیر آبادی کو لکھا کہ:

''عمدہ خوشبودار دو سیر تمبا کو کو خرید فرما کر باحتیاط ان کی ٹکیاں بندھوا کر، ہوا سے محفوظ کر کے، منشی صاحب کو تفویض کیجیے کہ ان کے ساتھ چلے آنا بآسانی ممکن ہے''۔۲۲۶

کوثر خیر آبادی، امیر سے ملاقات کے لیے لکھنؤ ہو کر آنے والے تھے۔ امیر کو 'عطر دانوں' اور 'قارولے' کی شیشیوں کی ضرورت تھی۔ جو لکھنؤ میں معیاری ملتی تھیں۔ چناں چہ امیر نے انھیں لکھا کہ: ''لکھنؤ ہو کر آنا ہو تو عطر دانوں کی شیشیاں اور چار شیشیاں قارولے کی بڑے منہ کے پائے تالہ سے لیتے آیئے گا''۔۲۲۷ مختار شاہجہان پوری کو لکھتے ہیں: ''چاقو بڑے چھوٹے دونوں قسم کے مطلوب ہیں''۔۲۲۸ ایک خط میں سنک اور نیچے وصول کرنے کے بعد لکھتے ہیں: ''سنک اور نیچے تیار ہو کر آپ کے

پاس سے آ گئے''۔۲۲۹ دل شاہجہاں پوری کو بھی رسیدی خط میں لکھتے ہیں: ''محبت نامہ سعادتِ شامہ آیا۔ شکر کی تھیلی بھی پہنچی''۔ ۲۳۰ ہر ہم کو پان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''دوبارہ پان بھیجنے کا شکریہ ... پان بھیجنے کی تکلیف بار بار تمھیں دی گئی ہے نہایت محجوب ہوں''۔۲۳۱ دل شاہجہاں پوری کے ذریعے شاہ عبدالقدیر کو پیغام بھجواتے ہیں کہ: ''حسبِ وعدہ سچے املی کے کوئلے جو چٹکتے نہ ہوں میرے پاس بھجوادیں''۔۲۳۲ ایک مرتبہ منشی امتیاز احمد خاں راز سے امیر نے کوئلوں کی فرمائش کی۔ جس کی تعمیل میں راز کو تاخیر ہوئی تو امیر نے انھیں پر لطف انداز میں لکھا کہ:

''پیارے راز ایک مطلع تھرتھراتے ہوئے دل سے کہا ہے اور کپکپائے ہوئے ہاتھوں سے لکھا ہے۔
سنو اور اس کی قدر کرو۔ شعر:

نہیں کچھ تاپنے کو ، دست و پا سردی سے اولے ہیں
نہ کھورا ہے ، نہ کنڈے ہیں ، نہ سیٹھے ہیں ، نہ کولے ہیں''۔۲۳۳

الغرض تلامذہ کے نام امیر کے مکتوبات کئی اعتبار سے اہم ہیں۔ ان کے کردار کے ایسے پہلو سامنے آئے ہیں جن سے ان کی شخصیت مکمل ہوتی ہے اور سوالات کے جوابات بھی مل جاتے ہیں، جو ہمارے ذہنوں میں یہ کرید پیدا کرتے ہیں کہ امیر کے شاگردوں کی کامیابی کے راز کیا ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ امیر کے تلامذہ کی کامیابی امیر کی شخصیت میں پوشیدہ تھی، یہ پہلا بڑا راز ہے۔ جو شاگرد جتنا امیر کے قریب رہا وہ اتنا زیادہ کام کا قرار پایا۔ اس لیے کہ امیر نے تلامذہ کی تربیت کے لیے اپنی زندگی کو نمونہ بنایا، کتابی درس و تدریس کا عمل تو بعد میں شروع ہوتا ہے۔ مکاتیب کے مطالعے سے تو یہ پتا چلتا ہے کہ امیر کے بہت سے شاگردان کے اخلاق و کردار کی بلندی کے باعث پہلے ان کے گرویدہ ہوئے پھر گرفتار اور بعد میں ایسے ہو گئے کہ رہائی نہ پا سکے اور امیر یے کہلائے۔

دوسرا راز ''دفتر امیر اللغات'' کے ماحول میں پوشیدہ ہے۔ یہ بظاہر ایک دفتر تھا۔ جس میں بیس پچیس کے لگ بھگ افراد کام کرتے تھے۔ جن میں امیر کے صاحب زادے، داماد، قریبی عزیز، شاگرد اور اس کے علاوہ بھی لوگ ملازم تھے۔ مکتوبات کا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ دفتر اصل میں ایک مدرسہ یا ایک خانقاہ تھی۔ جس کے سربراہ امیر مینائی تھے۔ جو حضرت شاہ مینا ؒ کے اخلاف میں سے تھے۔ مفتی بھی تھے اور شاعر بھی، لغت نویس بھی تھے اور تذکرہ نگار بھی دبستان لکھنؤ کی شعری روایات کے سرگرم نمائندہ بھی تھے اور نوابینِ رام پور کے استاد بھی۔ یہاں ہر کام کا ایک وقت مقرر تھا، ہر شخص بشمول، امیر، اس دفتر کے نظم وضبط کے پابند تھے۔ امیر اپنی تمام حیثیتوں کے ساتھ اراکین ''دفتر امیر اللغات'' کی سرگرمیوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ریاض، وسیم، جلیل وغیرہ ایک عرصے تک امیر کے زیرِ سایہ رہے بظاہر وہ دفتر کے معتمد تھے۔ لیکن اصل میں وہ طالب علم تھے۔ امیر کا ان پر ایسا رنگ چڑھا کہ ان لوگوں کا سلسلۂ تلمذ آج تک جاری ہے۔

تیسرا راز امیر کی مکتوب نویسی میں پوشیدہ ہے۔ امیر کے مکاتیب میں ان کی شخصیت کے اسرار اور دفتر کا پاکیزہ ماحول واضح نظر آتا ہے۔ امیر کا طریقہ یہ تھا کہ جو شاگرد دوسرے شہروں میں مقیم تھے۔ انھیں مصروف رکھنے کے لیے ان سے رابطہ میں رہتے۔ ان کی خیریت دریافت کرتے اگر جواباً شاگردوں کے خطوط نہیں آتے تھے تو بھی برا نہیں مناتے اور اپنی خط لکھنے کی روش تبدیل نہیں کرتے۔ امیر ان خطوط میں خیریت معلوم کرنے کے ساتھ شاگردوں کی کتابوں کی تفصیل معلوم کرتے۔ ضرورت

کی کتابیں تلاش کراتے، اس کی نقل حاصل کرنے کی ترکیبیں بتاتے، امیر اللغات کے لیے الفاظ کی فہرستیں بنواتے، الفاظ کی سندیں تلاش کراتے، ضرورت کی چیزوں کی فرمائش کرتے، پہلے چیزوں کا تخمینہ لگواتے پھر اشیاء خریدتے، شاگردوں کا کلام پڑھنے کے لیے منگواتے، اصلاح کے لیے کلام منگاتے جسے توجہ سے ملاحظہ کرتے اچھے کلام کی تعریف کرتے اور کلام میں نقص ہوتا تو علمی پیرائے میں نشان دہی کرتے۔ حواشی لکھتے، پھر بھی شاگردوں کی تشفی نہیں ہوتی تو لغات سے اور تاریخوں سے اسناد لکھتے، معرکہ آرائیوں سے بچنے کی تلقین کرتے، غرض کہ خلوص و محبت کا ایسا شان دار نمونہ پیش کرتے کہ شاگرد میں بھی زندگی کا سلیقہ آ جاتا اور ان پر ایسا علمی رنگ چڑھتا جسے دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ گویا امیر نے اپنی مکتوب نگاری سے لوگوں میں شعر و ادب اور زندگی گزارنے کا ایسا شعور پیدا کیا جس سے ہزاروں لوگ متاثر ہوئے اور امیر ایک ایسا حلقہ بنانے میں کام یاب ہو گئے جس نے ان کی شعری و ادبی روایات کو بھی پروان چڑھایا۔

امیر کے یہی رویے اور طریقے تھے۔ جس کی بدولت امیر کے شاگرد اپنے دور میں بڑے بڑے استادوں پر بھاری رہے۔ اس میں کوئی شک نہیں جو استادانہ شان امیر کی شخصیت میں تھی وہ ان کے معاصرین میں نظر نہیں آتی اس کے سب سے بڑے گواہ شاگردوں کے نام امیر کے مکتوبات ہیں۔

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد: ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، لاہور، آئینہ ادب، ۱۹۸۲ء، ص ۵۰۵۔

۲۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''مطالعہ امیر''، لاہور، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء، ص ۴۵۲۔

۳۔ کسریٰ منہاس ''تحقیقاتِ امیر مینائی: ''خطوط کی روشنی میں''، مضمون مشمولہ ''نقوش''، شمارہ جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۔

۴۔ سید عبدالحکیم حکمت: ''دبدبۂ امیر''، پٹنہ، برقی مشین پریس، ۱۹۳۷ء، ص ۱۳۳۔

۵۔ احسن اللہ ثاقب: ''خطوط منشی امیر احمد''، طبع اوّل، علی گڑھ، اردو پریس، ۱۹۱۰ء، ص ۳۱۔

۶۔ شاہ ممتاز علی آہ: ''امیر مینائی''، لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء، ص ۱۴۵۔

۷۔ ''نقوش''، خطوط نمبر، حصہ اوّل، ص ۴۲۴۔

۸۔ ''مطالعہ امیر''، ص ۴۶۱۔

۹۔ ''امیر مینائی''، ص ۱۴۵ تا ۱۴۸۔

۱۰۔ ''مطالعہ امیر''، ص ۴۵۵ تا ۴۶۱۔

۱۱۔ عرفان عباسی: ''دبستان امیر مینائی''، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۵ء۔

۱۲۔ سرفراز علی رضوی: ''ماخذات احوال شعراء و مشاہیر''، جلد سوم، کراچی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۸۷ء، ص ۲۷۱ تا ۲۷۶۔

۱۳۔ وزیر الحسن سعید زبیری، ہاشمی، سہسوانی: ''تذکرہ نامورانِ سہسوان''، کراچی، راشد زبیر اکیڈمی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۴۔

۱۴۔ حکیم نثار احمد علوی: ''سخنوران کاکوروی''، کراچی، میخانۂ ادب، ۱۹۷۸ء، ص ۷۰۔

۱۵۔ سید شہید حسین شہید بدایونی: ''تذکرہ شعرائے بدایوں''، حصہ اوّل، کراچی، مطبوعاتِ بدایوں، ۱۹۸۷ء۔

۱۶ ''تذکرہ ناموران سہسوان''، ص ۴۹۔
۱۷ ''تذکرہ شعرائے بدایوں''، حصہ اوّل، ص ۱۵۶۔
۱۸ یکتا جودھپوری: ''بہارِ سخن''، حیدرآباد، محبوب پریس، ۱۹۹۳ء، ص ۱۳۸۔
۱۹ ''تذکرہ شعرائے بدایوں''، حصہ اوّل، ص ۱۷۷۔
۲۰ رازیزدانی: مضمون، ''رام پور کا ماحول شعر و سخن''، لکھنؤ، نگار، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص ۳۴۔
۲۱ ایضاً۔
۲۲ ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۷۴۔
۲۳ نعیم الحق آزاد، شیخ پوری: ''حیات الشعراء''، میر پور خاص، بلدیہ میر پور خاص، سندھ، ۱۹۶۹ء، ص ۲۴۶۔
۲۴ ''تحقیقاتِ امیر مینائی: خطوط کی روشنی میں''، ص ۶۳۔
۲۵ ''امیر مینائی''، ص ۹۵۔
۲۶ پروفیسر نفیس صدیقی: ''داغ اور ان کے معاصرین''، مضمون مشمولہ ''نگار''، لکھنؤ، ۱۹۵۳ء، ص ۵۸۔
۲۷ ہفت روزہ ''ہماری زبان''، علی گڑھ، یکم نومبر ۱۹۶۳ء، ص ۸۔
۲۸ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۳۹۔
۲۹ ایضاً، ص ۱۸۹۔
۳۰ ایضاً، ص ۲۹۶۔
۳۱ ایضاً، ص ۲۲۱۔
۳۲ ایضاً، ص ۱۲۷۔
۳۳ ایضاً، ص ۲۹۸۔
۳۴ ایضاً، ص ۱۱۷۔
۳۵ ایضاً، ص ۱۷۸۔
۳۶ ایضاً، ص ۱۶۰۔
۳۷ ایضاً، ص ۱۵۵۔
۳۸ ایضاً، ص ۲۴۴۔
۳۹ ایضاً، ص ۲۶۶۔
۴۰ ''دبدبہ امیری''، ص ۱۳۳۔
۴۱ ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، ص ۵۱۶۔
۴۲ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۳۵۳۔
۴۳ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۴۴ ایضاً،ص۱۴۶۔
۴۵ ایضاً،ص۲۹۱۔
۴۶ ایضاً،ص۱۶۱۔
۴۷ ایضاً،ص۱۴۱۔
۴۸ ایضاً،ص۲۴۳۔
۴۹ ''مطالعہ امیر''،ص۹۰۔
۵۰ ''مکاتیب امیر مینائی''،ص۲۵۱۔
۵۱ ایضاً،ص۳۳۱۔
۵۲ ایضاً،ص۲۳۳۔
۵۳ ایضاً،ص۱۱۳۔
۵۴ ایضاً،ص۱۲۹۔
۵۵ ایضاً،ص۱۲۸۔
۵۶ ایضاً،ص۲۹۹۔
۵۷ ایضاً۔
۵۸ ایضاً،ص۲۹۷۔
۵۹ ایضاً،ص۱۲۷۔
۶۰ ایضاً،ص۲۶۹۔
۶۱ ایضاً،ص۱۳۴۔
۶۲ ایضاً،ص۱۱۱۔
۶۳ ایضاً،ص۱۳۵۔
۶۴ ایضاً،ص۱۳۷۔
۶۵ ایضاً،ص۱۴۱۔
۶۶ ایضاً،ص۱۱۷۔
۶۷ ''نگار''،لکھنؤ،نومبر۱۹۵۰ء،ص۳۶۔
۶۸ ''مکاتیب امیر مینائی''،ص۱۱۴۔
۶۹ ایضاً،ص۱۴۴۔
۷۰ ایضاً،ص۱۹۳۔
۷۱ ایضاً،ص۱۱۲۔

۷۲ ''امیر مینائی''، ص ۲۰۔
۷۳ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۹۹۔
۷۴ ''زمانہ''، کانپور، فروری ۱۹۰۶ء، ص ۹۱،
۷۵ صفدر مرزا پوری: ''مشاطۂ سخن''، جلد اوّل، لکھنؤ، صدیق بک ڈپو، ۱۳۳۶ھ، ص ۵۵ تا ۸۵۔
۷۶ صفدر مرزا پوری: ''مشاطۂ سخن''، جلد دوم، لاہور، سنہ ندارد، ص ۵۹ تا ۶۶۔
۷۷ امیر مینائی، ص ۹۵ تا ۹۶۔
۷۸ ''حیات الشعراء''، ص ۲۳۶ تا ۲۲۲، ص ۲۴۶، تا ۲۵۱۔
۷۹ امیر مینائی اور ان کے تلامذہ، ص ۵۱۷ تا ۵۳۳۔
۸۰ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۶۰۔
۸۱ ''مشاطۂ سخن''، حصہ دوّم، ص ۵۸۔
۸۲ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۶۶۔
۸۳ ''مشاطۂ سخن''، حصہ دوّم، ص ۶۰۔
۸۴ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۶۸۔
۸۵ ''مشاطۂ سخن''، حصہ دوّم، ص ۵۹۔ اس اصلاح پر ۲۶ر فروری ۱۸۹۱ء درج ہے۔ جب کہ اس سے متعلق خط جو ''مکاتیب امیر مینائی'' (ص ۱۶۸) میں ہے، اُس پر ۲۰ر جولائی ۱۸۹۱ء ہے۔ اس کے علاوہ ''مکاتیب امیر مینائی'' میں ۲۶ر جولائی ۱۸۹۱ء کے مکتوب میں اسی غزل (ہوسِ نقشِ پا) سے متعلق وضاحتیں ہیں، جس کا ذکر ۲۰ر جولائی والے خط اور ۲۶ر فروری ۱۸۹۱ء (مشاطۂ سخن) کی اصلاح میں ملتا ہے۔
غالباً ہوا یہ ہے کہ امیر نے ۲۰ر جولائی والے خط کے ساتھ اصلاح بھیج دی تھی۔ بقول امیر: ''ہجومِ انتشار میں غزل دیکھی ... مجھے فرصت واطمینان نہیں ہے ورنہ وجوہ بھی حواشی پر لکھ دیتا''۔ (ص ۱۴۸) بعد میں جب امیر کو فرصت ہوئی تو انھوں نے ۲۶ر جولائی ۱۸۹۱ء کو وجوہات بھی لکھ بھیجیں۔ چناں چہ ۲۰ر جولائی اور ۲۶ر جولائی والے خط موضوع کی مناسبت سے مربوط ہیں اور دونوں پر سال ۱۸۹۱ء ہے۔ لہٰذا اب ''مشاطۂ سخن'' میں اس خط پر جولائی کے بجائے فروری کا لکھا جانا کتابت کی غلطی قرار دیا جاسکتا ہے۔
۸۶ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۷۱۔
۸۷ ''مشاطۂ سخن''، حصہ دوم، ص ۶۰۔
اس اصلاح پر تاریخ ۲۰ر جنوری ۱۸۹۲ء درج ہے۔ جب کہ اس اصلاح سے متعلق خط جو کہ ''مکاتیب امیر مینائی'' میں شامل ہے۔ اس پر ۳۰ر جنوری ۱۸۹۲ء (ص ۱۷۱) درج ہے۔ یہ اصطلاح جس غزل پر ہے۔ اس کی ردیف ''جامِ شراب'' ہے۔ اسی غزل سے متعلق ایک خط (مکاتیب امیر مینائی) میں ۱۳ر جنوری ۱۸۹۲ء کا بھی ملتا ہے۔ جس میں امیر اپنی بیماری کے باعث غزل نہ دیکھنے کی معذرت کرتے ہیں۔ ہمارے خیال میں ۲۰ر جنوری ہونا زیادہ

قرین قیاس ہے۔

۸۸ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۸۲۔

۸۹ ''مشاطۂ سخن''، حصہ اوّل، ص ۶۰۔

۹۰ ایضاً، ص ۱۸۷۔

۹۱ ''مشاطۂ سخن''، حصہ دوم، ص ۶۱۔

امیر کی اس اصلاح پر ۲۵؍اگست ۱۸۹۳ء درج ہے۔ جب کہ اس اصلاح سے متعلق خط جو ''مکاتیب امیر مینائی'' میں شامل ہے۔ اس پر ۳۰؍جون ۱۸۹۳ء ہے۔ یہی درست ہے۔ کیوں کہ اسی تاریخ کے خط میں اس اصلاح سے متعلق امیر کی تصریحات ہیں جب کہ ۲۵؍اگست ۱۸۹۳ء کے خط میں جو ''مکاتیب امیر مینائی'' میں شامل ہے۔ اصلاح والی غزل سے متعلق کوئی صراحت نہیں ملتی۔

۹۲ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۸۸۔

۹۳ ایضاً، ص ۱۹۷۔

۹۴ ''مشاطۂ سخن''، حصہ اوّل، ص ۶۱۔

اس اصلاح پر ۲۲؍جون ۱۸۹۴ء کی تاریخ درج ہے۔ جب کہ اس سے متعلق خط پر ۱۳؍جون ۱۸۹۴ء ہے۔ امیر نے اس مکتوب میں زاہد کو لکھا ہے کہ: ''غزل کسی وقت دیکھ کر بھیجوں گا''۔ چناں چہ امیر نے ۱۳؍جون کو صرف خط ارسال کیا جب کہ ۲۲؍جون کو اصلاح۔

۹۵ ''مکاتیب امیر مینائی''، حصہ اوّل، ص ۱۹۹۔

۹۶ ''مشاطۂ سخن''، حصہ اوّل، ص ۶۱۔

۹۷ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۱۲۔

۹۸ ''مشاطۂ سخن''، حصہ اوّل، ص ۶۱۔

۹۹ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۱۳۔

۱۰۰ ''مشاطۂ سخن''، حصہ اوّل، ص ۶۲۔

۱۰۱ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۱۶۔

۱۰۲ ''مشاطۂ سخن''، حصہ اوّل، ص ۶۲۔

۱۰۳ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۲۳۔

۱۰۴ ''مشاطۂ سخن''، حصہ اوّل، ص ۶۳۔

۱۰۵ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۶۳۔

۱۰۶ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۲۵۔

۱۰۷ ایضاً، ص ۲۳۰۔

۱۰۸۔ ایضاً،ص۲۳۱۔
۱۰۹۔ ایضاً،ص۲۳۵۔
۱۱۰۔ ’’مشاطۂ سخن‘‘،حصہ اوّل،ص۶۵۔
۱۱۱۔ ’’مکاتیب امیر مینائی‘‘،ص۲۳۶۔
۱۱۲۔ ایضاً،ص۳۴۳۔
۱۱۳۔ ایضاً،ص۱۵۵۔
۱۱۴۔ ایضاً،ص۲۱۸۔
۱۱۵۔ ایضاً،ص۲۵۴۔
۱۱۶۔ ایضاً،ص۱۱۶۔
۱۱۷۔ ایضاً،ص۲۸۹۔
۱۱۸۔ ایضاً،ص۱۹۷۔
۱۱۹۔ ایضاً،ص۲۴۹۔
۱۲۰۔ ایضاً،ص۳۷۲۔
۱۲۱۔ ایضاً،ص۳۳۷۔
۱۲۲۔ ماہ نامہ ’’نگار‘‘،لکھنؤ،نومبر ۱۹۵۰ء،ص۳۶۔
۱۲۳۔ ’’مکاتیب امیر مینائی‘‘،ص۳۳۹۔
۱۲۴۔ ایضاً،ص۲۹۱۔
۱۲۵۔ ایضاً۔
۱۲۶۔ ایضاً،ص۲۹۲۔
۱۲۷۔ ایضاً،ص۳۴۱۔
۱۲۸۔ ایضاً،ص۳۴۳۔
۱۲۹۔ ایضاً،ص۲۱۲۔
۱۳۰۔ ایضاً۔
۱۳۱۔ ایضاً،ص۲۴۹۔
۱۳۲۔ ایضاً،ص۱۵۷۔
۱۳۳۔ ایضاً،ص۱۴۷۔
۱۳۴۔ ’’امیر مینائی،ص۲۰۔
۱۳۵۔ ایضاً،ص۵۱۔

۱۳۶۔ ایضاً،ص۲۱۶۔
۱۳۷۔ ایضاً،ص۲۱۷۔
۱۳۸۔ ایضاً،ص۲۲۷۔
۱۳۹۔ ایضاً،ص۲۲۸۔
۱۴۰۔ ایضاً،ص۲۲۹۔
۱۴۱۔ ایضاً،ص۲۶۳۔
۱۴۲۔ ایضاً،ص۱۵۰۔
۱۴۳۔ ''سوانحِ امیر''،ص۱۷۔
۱۴۴۔ ''مکاتیبِ امیر مینائی''،ص۲۱۳۔
۱۴۵۔ ایضاً،ص۱۶۶۔
۱۴۶۔ ایضاً،ص۱۷۲۔
۱۴۷۔ ایضاً،ص۱۳۱۔
۱۴۸۔ ایضاً،ص۱۴۲۔
۱۴۹۔ غیر مطبوعہ خط بنام: احمد حسین خان مذاق،مورخہ ۴؍دسمبر ۱۸۹۱ء
۱۵۰۔ غیر مطبوعہ خط بنام: نواب عالم گیر خاں،مورخہ ۲۴؍اگست ۱۸۹۰ء۔
۱۵۱۔ صہبائے مینائی،ص۲۲۶۔
۱۵۲۔ ''نقوش'' مکاتیب نمبر،نومبر ۱۹۵۷ء،ص۱۲۹۔
۱۵۳۔ ''مکاتیب امیر مینائی''،ص۲۲۶۔
۱۵۴۔ ایضاً،ص۲۰۰۔
۱۵۵۔ ایضاً،ص۲۲۶۔
۱۵۶۔ ''امیر مینائی اوران کے تلامذہ''،ص۴۶۳۔
۱۵۷۔ ''مکاتیبِ امیر مینائی''،ص۱۹۲۔
۱۵۸۔ ایضاً،ص۱۸۰۔
۱۵۹۔ ایضاً،ص۱۱۶۔
۱۶۰۔ ایضاً،ص۲۴۵۔
۱۶۱۔ ایضاً،ص۱۶۶۔
۱۶۲۔ ایضاً،ص۱۱۰۔
۱۶۳۔ ایضاً،ص۱۱۵۔

۱۶۴۔ ایضاً،ص۳۰۴۔
۱۶۵۔ ''نقوشِ مکاتیب نمبر''،ص۱۲۶۔
۱۶۶۔ ''مکاتیبِ امیر مینائی''،ص۳۰۸۔
۱۶۷۔ ایضاً،ص۱۴۷۔
۱۶۸۔ ایضاً،ص۳۵۰۔
۱۶۹۔ ایضاً،ص۲۹۳۔
۱۷۰۔ ایضاً،ص۱۵۹۔
۱۷۱۔ ایضاً،ص۱۶۶۔
۱۷۲۔ ایضاً،ص۲۴۶۔
۱۷۳۔ ایضاً،ص۱۵۳۔
۱۷۴۔ ایضاً،ص۱۶۵۔
۱۷۵۔ غیر مطبوعہ خط مورخہ ۶/جون ۱۹۹۲ء۔
۱۷۶۔ ''مکاتیب امیر مینائی''،ص۲۱۶۔
۱۷۷۔ ایضاً،ص۲۹۰۔
۱۷۸۔ ایضاً،ص۲۹۱۔
۱۷۹۔ ایضاً،ص۲۷۱۔
۱۸۰۔ ایضاً،ص۱۳۲۔
۱۸۱۔ ایضاً،ص۱۴۰۔
۱۸۲۔ ایضاً،ص۱۰۷۔
۱۸۳۔ ایضاً،ص۱۱۴۔
۱۸۴۔ ایضاً،ص۱۱۸۔
۱۸۵۔ ایضاً،ص۱۱۹۔
۱۸۶۔ ایضاً،ص۱۱۳۔
۱۸۷۔ ایضاً،ص۱۱۷۔
۱۸۸۔ ایضاً،ص۱۱۸۔
۱۸۹۔ ایضاً،ص۱۲۱۔
۱۹۰۔ ایضاً،ص۲۹۲۔
۱۹۱۔ ایضاً،ص۱۵۴۔

۱۹۲ ہفت روزہ ''ہماری زبان''، علی گڑھ، ص ۸۔
۱۹۳ ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۳۵۔
۱۹۴ ایضاً، ص ۳۱۱۔
۱۹۵ ایضاً، ص ۱۴۴۔
۱۹۶ ''نقوش''، مکاتیب نمبر ۱۲۵۔
۱۹۷ ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۱۰۹۔
۱۹۸ ہفت روزہ ''ہماری زبان''، علی گڑھ، ص ۸۔
۱۹۹ ''مکاتیبِ امیر مینائی''، ص ۳۵۷۔
۲۰۰ ایضاً، ص ۱۲۱۔
۲۰۱ ایضاً، ص ۱۱۷۔
۲۰۲ ایضاً، ص ۱۰۸۔
۲۰۳ ایضاً، ص ۱۱۵۔
۲۰۴ ایضاً، ص ۳۱۶۔
۲۰۵ ایضاً، ص ۳۱۰۔
۲۰۶ ایضاً، ص ۱۱۰۔
۲۰۷ ایضاً، ص ۱۱۵۔
۲۰۸ ایضاً، ص ۲۲۷
۲۰۹ ایضاً، ص ۱۶۱۔
۲۱۰ ایضاً، ص ۱۶۸۔
۲۱۱ ایضاً، ص ۲۹۱۔
۲۱۲ ایضاً، ص ۳۲۱۔
۲۱۳ ایضاً، ص ۳۲۴۔
۲۱۴ ایضاً، ص ۳۲۴۔
۲۱۵ ایضاً، ص ۳۲۴۔
۲۱۶ ایضاً، ص ۳۲۷۔
۲۱۷ ایضاً، ص ۲۵۶۔
۲۱۸ ایضاً، ص ۲۵۵۔
۲۱۹ ہفت روزہ ''ہماری زبان''، علی گڑھ، ص ۹۔

۲۲۰ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۳۱۹۔
۲۲۱ ایضاً، ص ۳۲۴۔
۲۲۲ ایضاً، ص ۱۹۹۔
۲۲۳ ایضاً، ص ۲۲۷۔
۲۲۴ ''اردو معلیٰ''، علی گڑھ، ص ۲۸۔
۲۲۵ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۳۲۔
۲۲۶ ''نقوش''، خطوط نمبر، اپریل مئی ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۶۔
۲۲۷ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۴۰۔
۲۲۸ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۲۹۔
۲۲۹ ایضاً، ص ۱۲۴۔
۲۳۰ ''نقوش'' مکاتیب نمبر، ص ۲۱۷
۲۳۱ ایضاً، ص ۱۲۷۔

فہرستِ اسنادِ محولہ:

۱۔ احمد، کریم الدین، ڈاکٹر: ۱۹۸۲ء، ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، آئینۂ ادب، لاہور۔
۲۔ بدایونی، شہید، شہید حسین، سید: ۱۹۸۷ء، ''تذکرۂ شعراء بدایوں''، حصہ اوّل، مطبوعات بدایوں، کراچی۔
۳۔ ثاقب، احسن اللہ: ۱۹۱۰ء، ''مکاتیب منشی امیر احمد''، طبع اول، اردو پریس، علی گڑھ۔
۴۔ جودھپوری، یکتا: ۱۹۹۳ء، ''بہارِ سخن''، محبوب پریس، حیدر آباد۔
۵۔ حکمت، عبدالحکیم، سید: سن ندارد، ''دبدبۂ امیر''، برقی مشین پریس، پٹنہ، انڈیا۔
۶۔ رضوی، سرفراز علی: ۱۹۸۷ء، ''ماخذاتِ احوال و شعراء و مشاہیر''، جلد سوم، انجمن ترقی اردو، کراچی۔
۷۔ زیدی، نظیر حسنین، سید: ۱۹۸۵ء، ''تذکرہ منتخب روزگار سہسوان''، مکتبہ مسعود، کراچی۔
۸۔ سحر، ابو محمد، ڈاکٹر: ۱۹۶۴ء، ''مطالعۂ امیر''، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔
۹۔ سلطانہ بخش، ڈاکٹر: ۱۹۸۸ء، ''اصولِ تحقیق''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔
۱۰۔ سہسوانی، ہاشمی، سعید زبیری، وزیر الحسن: ۱۹۸۵ء، ''تذکرہ نامورانِ سہسوان''، راشد زبیر اکیڈمی، کراچی۔
۱۱۔ شیخ پوری، آزاد، نعیم الحق: ۱۹۶۹ء، ''حیات الشعراء''، میر پور خاص بلدیہ، میر پور خاص، سندھ۔
۱۲۔ عباسی، عرفان: ۱۹۸۵ء، ''دبستان امیر مینائی''، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ۔
۱۳۔ علوی، نثار احمد، حکیم: ۱۹۷۸ء، ''سخنوارانِ کاکوروی''، میخانۂ ادب، کراچی۔
۱۴۔ مرزا پوری، صفدر: ۱۳۳۶ھ، ''مشاطۂ سخن''، جلد اوّل، صدیق بک ڈپو، لکھنؤ۔

۱۵۔ مرزا پوری، صفدر: سن ندارد، ''مشاطۂ سخن''، جلد دوم، لاہور۔

رسائل:

۱۔ ہفت روزہ ''ہماری زبان''، علی گڑھ، یکم نومبر ۱۹۶۳ء۔

۲۔ ماہ نامہ ''زمانہ'' کان پور، فروری ۱۹۰۶ء۔

۳۔ سہ ماہی ''نقوش''، جنوری ۱۹۶۳ء، خطوط نمبر حصہ اوّل، خطوط نمبر حصہ دوم، لاہور۔

۴۔ ماہ نامہ ''نگار''، لکھنؤ، ۱۹۵۰ء، ۱۹۵۳ء، اکتوبر ۱۹۵۸ء۔

۵۔ ''نیرنگ''، فروری مارچ ۱۹۳۰ء، امیر نمبر، دہلی۔